اگست ۲۰۲۶ء

پاک جمہوریت

وزارتِ اطلاعات ونشریات کا جریدہ

جلد :66 شمارہ :08

DIRECTORATE OF ELECTRONIC MEDIA AND PUBLICATIONS

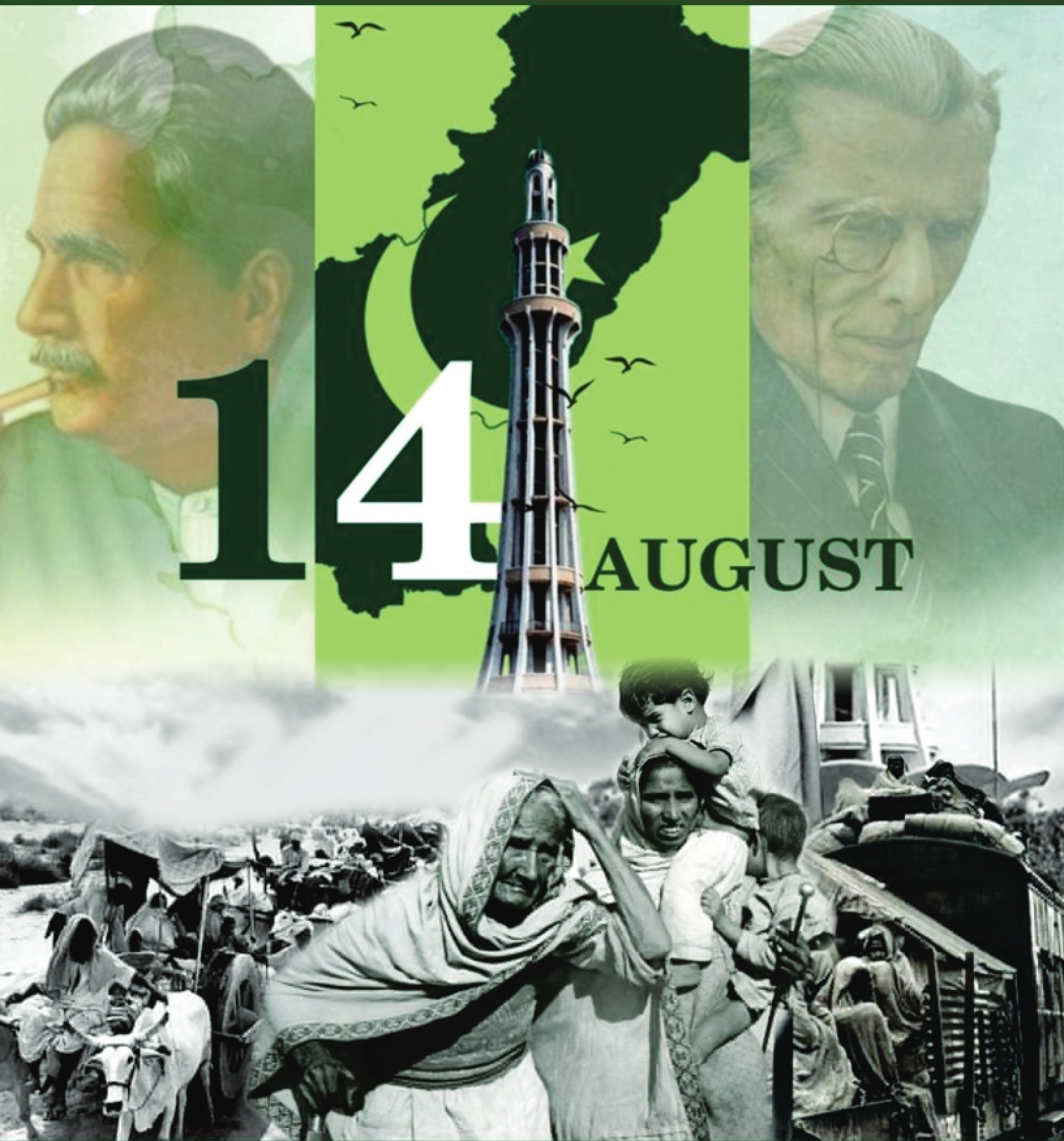

DIRECTORATE OF ELECTRONIC MEDIA AND PUBLICATIONS

اگست ۲۰۲۶ء

پاک جمہوریت

وزارتِ اطلاعات ونشریات کا جریدہ

جلد:66 شمارہ:08

	اداریہ		۵
۱۔	قائداعظم کا پاکستان اور ہمارا قومی کردار وطن عزیز کی ترقی کے لیے ہم کتنے ہیں تیار	محمد زکریا	۶
۲۔	پانی کی جنگ یا سفارت کاری؟ سندھ طاس معاہدہ اور جنوبی ایشیا کا مستقبل	امتیاز احمد تارڑ	۱۵
۳۔	سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ اور خواتین کے حقوق	رباب زہرا	۲۴
۴۔	مون سون بارشیں چیلنجز، حقائق، ذمہ داری	ناصر نقوی	۲۹
۵۔	کلائمیٹ سپورٹ لیوی میں اضافہ ماحولیاتی تحفظ یا عوام پر نیا بوجھ؟	کنول افتخار	۳۴
۶۔	پاکستان کی نوجوان افرادی قوت روزگار کے مواقع اور مستقبل	ڈاکٹر محمد گلزار	۴۱

نگرانِ اعلیٰ: عمرانہ وزیر

نگران: محمد سلیم

مینجنگ ایڈیٹر: شبیہ عباس

ایڈیٹر: مائرہ جاوید

ڈیزائنر: محمد وسیم

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز،
291۔اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور

انتظامیہ: 042-99333909
مدیر: 042-99333912
email:editor@pakjamhuriat.org

انتباہ

ادارے اور میگزین ''پاک جمہوریت'' کا مقصد عوام الناس کو آگاہ کرنا اور بہترین مواد مہیّا کرنا ہے۔ البتہ شمارے میں شامل تمام مضامین مصنفین کی ذاتی آراء پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا ادارے یا ادارے کے کسی فرد پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اداریہ

گزشتہ چند برسوں سے مون سون کی شدید بارشیں پاکستان میں ہر سال بڑے پیمانے پر تباہی، بے گھر ہونے اور مالی نقصانات کا سبب بن رہی ہیں، جس کی بڑی وجہ دریاؤں اور آبی گزرگاہوں کے قریب آبادیاں اور موسمیاتی تبدیلی کے بڑھتے ہوئے اثرات ہیں۔ حکومت نے متاثرین کی بحالی کے لیے کلائمیٹ چینج لیوی عائد کی ہے، تاہم ناقدین اسے عوام پر اضافی بوجھ قرار دیتے ہیں۔ دوسری جانب بھارت کی جانب سے بارشوں میں اضافی پانی چھوڑنے اور خشک موسم میں پاکستان کے حصے کا پانی محدود کرنے کے باعث سندھ طاس معاہدہ اپنی افادیت کھوتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی دوران سپریم کورٹ نے خواتین کے حقِ مہر کے تحفظ کو یقینی بنانے کا اہم فیصلہ دیا، جبکہ پاکستان کی نوجوان آبادی کو ایک چیلنج کے ساتھ ساتھ ترقی کا سنہری موقع بھی قرار دیا جا رہا ہے، بشرطیکہ انہیں تعلیم، مہارت اور روزگار کے بہتر مواقع فراہم کیے جائیں۔ اس اگست پاکستان اپنی آزادی کی 80ویں سالگرہ منائے گا، جو بانیانِ پاکستان کی قربانیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ایک مضبوط، خوشحال اور مستحکم پاکستان کے عزم کی تجدید کا موقع ہے۔

شکریہ

ایڈیٹر پاک جمہوریت

قائداعظم کا پاکستان اور ہمارا قومی کردار
وطن عزیز کی ترقی کیلئے ہم کتنے ہیں تیار؟

محمد زکریا
(مصنف، کالم نگار ہیں اور پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں)

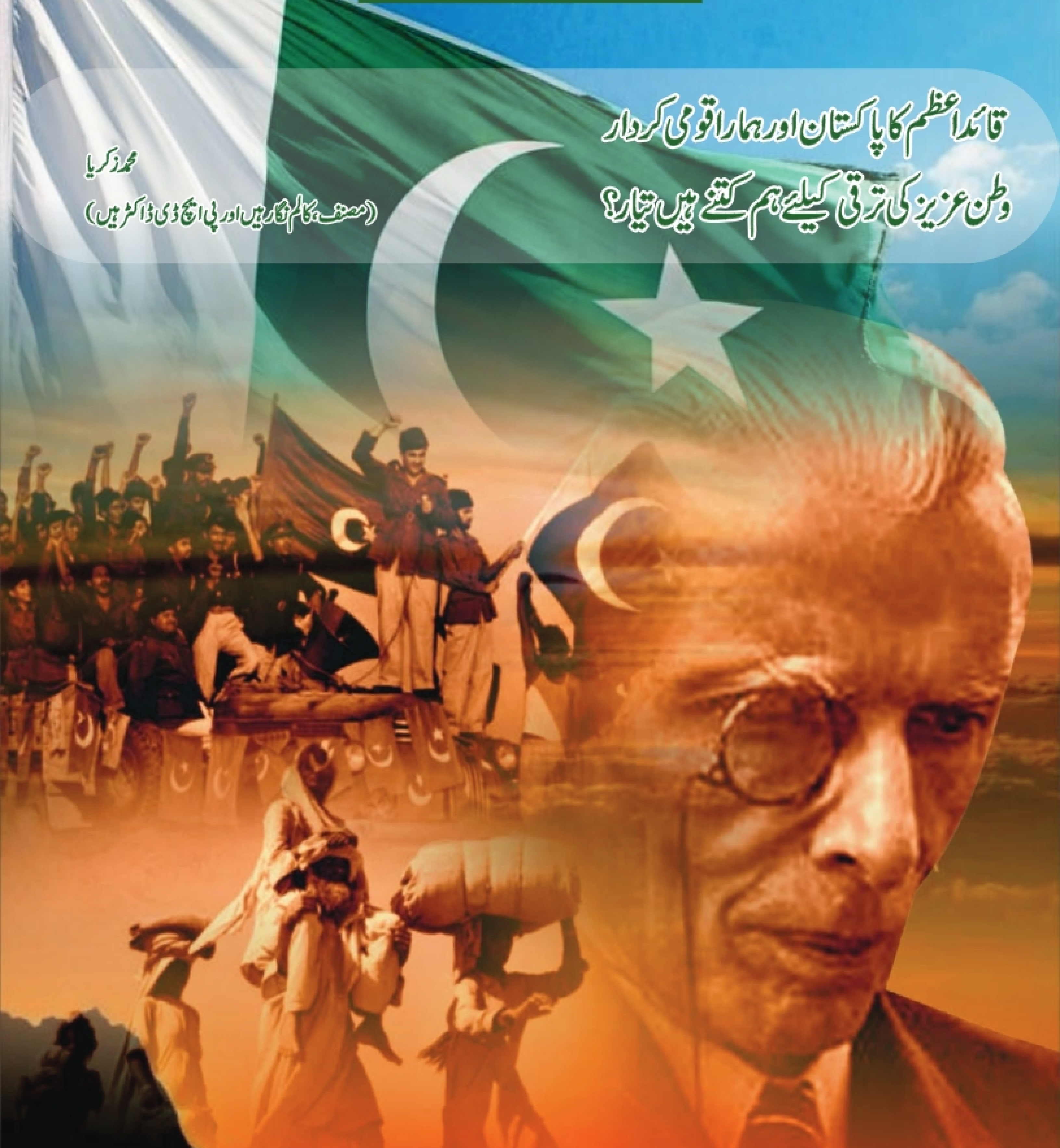

آزادی صرف جغرافیائی تبدیلی ہی کا نام نہیں بلکہ آزادی، نئے تہذیبی، سیاسی، فکری اور معاشی سفر کے آغاز کا نام ہے۔ 14 اگست 1947 بھی برصغیر کے مسلمانوں کے لیے محض ایک نئے پرچم، نئی سرحد یا نئی حکومت کا دن نہیں تھا بلکہ یہ اس طویل جدوجہد کی تکمیل تھی جس کی بنیاد تقریباً ایک صدی قبل اس احساس کے ساتھ رکھی گئی تھی کہ ہندوستان کے مسلمان ایک الگ مذہبی گروہ ہی نہیں بلکہ ایک جداگانہ تہذیب، تاریخ، سیاسی شعور اور اجتماعی تشخص رکھنے والی قوم ہیں۔ یہی وہ احساس تھا جس نے بالآخر "دوقومی نظریے" کو جنم دیا اور اسی نظریے نے پاکستان کے قیام کی راہ ہموار کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس قوم نے اپنی آزادی کے لیے اتنی بڑی قربانیاں دیں، کیا وہ آزادی کے بعد اپنے خوابوں کی ریاست بھی تشکیل دے سکی؟ یہی سوال آج بھی پاکستان کی سیاسی، آئینی اور معاشرتی بحث کا محور ہے۔

1857 کی جنگِ آزادی برصغیر کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس جنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں نے شرکت کی، لیکن اس کی ناکامی کے بعد برطانوی حکومت نے بالخصوص مسلمانوں کو اپنی بدگمانی کا مرکز بنایا۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے نے مسلمانوں کو صرف سیاسی اقتدار سے محروم نہیں کیا بلکہ ان کی معاشی، تعلیمی اور سماجی حیثیت بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ نئی انتظامیہ، جدید تعلیم اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی شرکت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ ایک ایسی قوم جو صدیوں تک اقتدار کی علامت رہی تھی، اچانک خود کو سیاسی تنہائی، معاشی زوال اور تعلیمی پسماندگی میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگی۔ اسی دور میں سر سید احمد خان نے یہ حقیقت محسوس کی کہ اگر مسلمان جدید علوم، سائنسی

فکراور سیاسی شعور سے خود کو آراستہ نہیں کریں گے تو وہ ہمیشہ کیلئے تاریخ کے صفحات سے دستبردار ہو جائیں گے۔علی گڑھ تحریک محض ایک تعلیمی منصوبہ نہیں تھی بلکہ یہ مسلمانوں کی فکری تشکیلِ نو کی تحریک تھی۔سرسید نے مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ مستقبل کی سیاست صرف جذبات سے نہیں بلکہ تعلیم، تنظیم اور جدید ریاستی شعور سے تشکیل پائے گی۔یہی وہ فکری بنیاد تھی جس پر آگے چل کر مسلم لیگ کی سیاست نے جنم لیا۔

1906 میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام دراصل اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے ایک مستقل پلیٹ فارم چاہتے ہیں۔اس وقت تک ہندوستان میں قومی سیاست کی بڑی دعویدار انڈین نیشنل کانگریس تھی، لیکن مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو یہ خدشہ تھا کہ نمائندہ جمہوریت کے نام پر اکثریتی آبادی ہمیشہ اقلیت پر غالب رہے گی۔یہی خدشات بعدازاں جداگانہ انتخابات، آئینی تحفظات اور وفاقی ڈھانچے کے مطالبات کی بنیاد بنے۔قائداعظم محمد علیؒ جناح کی سیاست کا آغاز ایک ایسے رہنما کے طور پر ہوا جو ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعیوں میں شمار ہوتے تھے۔انہیں ایک وقت میں "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" بھی کہا جاتا تھا، لیکن وقت کے ساتھ انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی سیاست میں اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ صرف انتخابی نظام کا نہیں بلکہ طاقت کی تقسیم، ثقافتی شناخت اور آئینی تحفظ کا مسئلہ ہے۔یہی احساس ان کی سیاست میں ایک بنیادی تبدیلی کا سبب بنا۔

1928 میں نہرو رپورٹ سامنے آئی تو قائداعظم نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کو نظرانداز کیا جا رہا ہے۔اس کے جواب میں انہوں نے اپنے تاریخی چودہ نکات پیش کیے، جو محض چند آئینی مطالبات نہیں تھے بلکہ مستقبل کے وفاقی ہندوستان کا ایک جامع سیاسی خاکہ تھے۔ان نکات میں وفاقی نظام، صوبائی خودمختاری، جداگانہ انتخابات، اقلیتوں کے حقوق، مذہبی آزادی اور مسلمانوں کی مؤثر نمائندگی جیسے اصول شامل تھے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ آج بھی پاکستان کے وفاقی ڈھانچے، صوبائی اختیارات اور آئینی مباحثہ میں ان نکات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

1930 میں علامہ محمد اقبالؒ نے الٰہ آباد کے تاریخی خطبے میں پہلی مرتبہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں کو ایک الگ سیاسی وحدت کے طور پر منظم کرنے کا تصور پیش کیا۔اقبال کا تصور کسی مذہبی ریاست کا خاکہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسی سیاسی اکائی چاہتے تھے جہاں مسلمان اپنی تہذیبی اور سیاسی شناخت کے مطابق ترقی کر سکیں۔بعد میں یہی فکر قراردادِ لاہور اور قیامِ پاکستان کی نظریاتی بنیاد بنی۔1940 کی قراردادِ لاہور سے لے کر 1947 تک کا عرصہ برصغیر کی سیاسی تاریخ کا شاید سب سے تیز رفتار دور تھا۔دوسری جنگِ عظیم، برطانوی کمزوری، کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات، کیبنٹ مشن پلان، انتخابات اور بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات نے برصغیر کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا جہاں تقسیم کے سوا کوئی قابلِ عمل سیاسی حل باقی نہ رہا۔تاہم یہ کہنا کہ پاکستان صرف فسادات یا سیاسی تعطل کا نتیجہ تھا، تاریخی حقیقت سے انصاف نہیں ہوگا۔پاکستان ایک مسلسل سیاسی، فکری اور آئینی جدوجہد کا حاصل تھا، جس کی جڑیں کئی دہائیوں پر محیط تھیں۔

قیام پاکستان بیسویں صدی کے سب سے بڑے انسانی انخلاؤں میں سے ایک تھا۔لاکھوں لوگ ہجرت پر مجبور ہوئے ، بے شمار خاندان بچھڑ گئے ، ہزاروں جانیں قربان ہوئیں اور ایک نئے ملک نے انتہائی محدود وسائل کے ساتھ اپنی ریاستی زندگی کا آغاز کیا۔اس کے باوجود پاکستان نے ابتدائی برسوں میں جس رفتار سے ریاستی ادارے قائم کیے، وہ اپنی جگہ ایک غیر معمولی کامیابی تھی۔مہاجرین کی آبادکاری، نئی بیوروکریسی،فوج، مرکزی بینک، خارجہ پالیسی اور انتظامی ڈھانچے کی تشکیل ایسے چیلنجز تھے جن کا سامنا دنیا کی بہت کم نئی ریاستوں کو ایک ساتھ کرنا پڑا۔ان تمام مشکلات کے باوجود قائداعظم محمد علیؒ جناح کی قیادت نے پاکستانی قوم کو ایک واضح سمت سے روشناس کروایا۔ان کی تقاریر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی ریاست کے خواہاں تھے جہاں قانون کی حکمرانی، آئین کی بالادستی، مذہبی آزادی، اقلیتوں کا تحفظ، دیانت دار طرزِ حکمرانی اور معاشی انصاف ریاست کے بنیادی ستون ہوں۔وہ بار بار نظم وضبط، اتحاد اور ایمان کی بات کرتے تھے،ان تین الفاظ کو محض نعرہ نہیں بلکہ ایک قومی نظم کے اصول کے طور پر پیش کرتے تھے۔

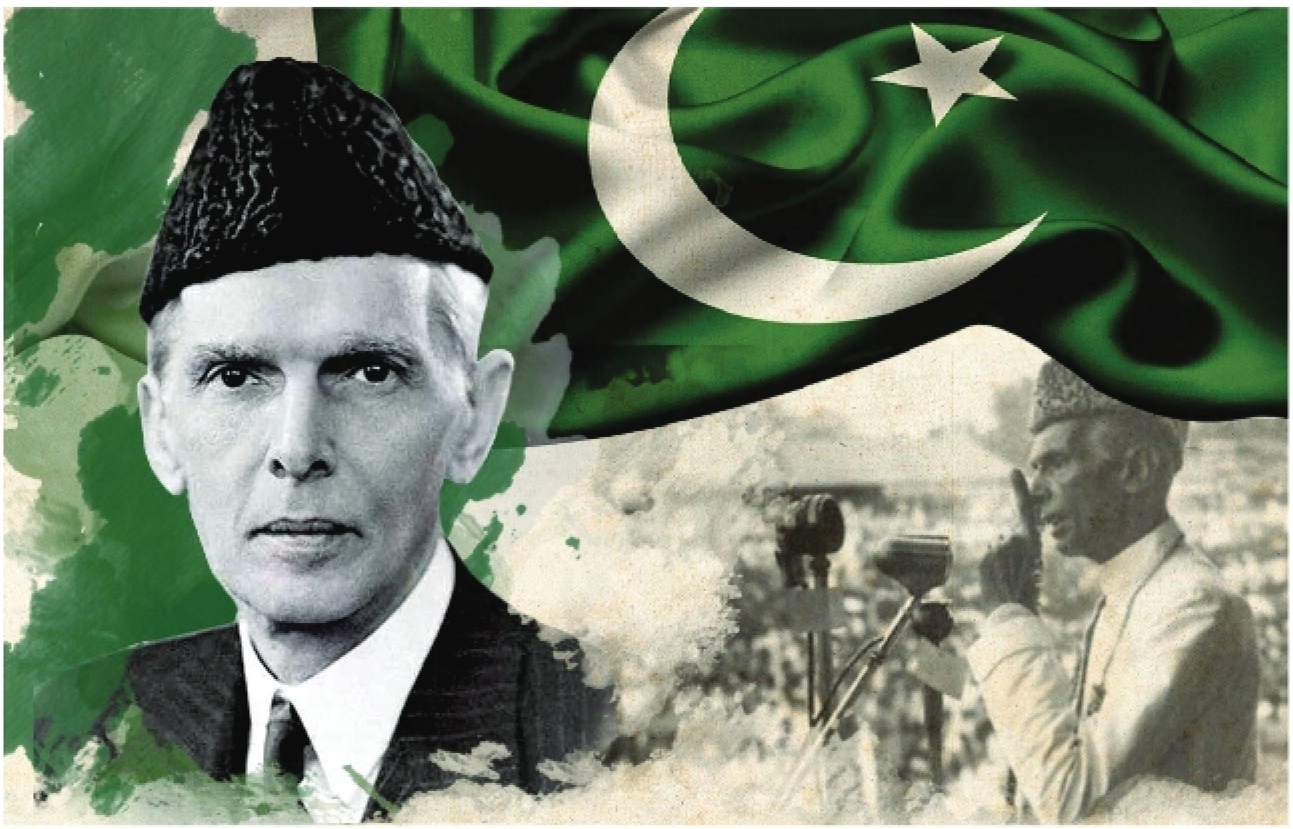

آج، جب پاکستان اپنے قیام کے آٹھ دہائیوں کے قریب پہنچ چکا ہے، تو یہ سوال پہلے سے کئی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ کیا ہم نے قائداعظمؒ کے اس وژن کو ریاستی پالیسیوں، آئینی اداروں اور قومی کردار کا حصہ بنایا؟ یا ہم آزادی حاصل کرنے کے بعد ریاست سازی کے اس مشکل مرحلے میں کہیں پیچھے رہ گئے؟ یہی وہ سوال ہے جہاں سے پاکستان کی اصل کہانی شروع ہوتی ہے، کیونکہ آزادی حاصل کرنا نسبتاً

آسان تھا، مگر ایک مضبوط اور متحد ریاست تعمیر کرنا کہیں زیادہ دشوار ثابت ہوا۔

اگر تحریکِ پاکستان کو محض ایک سیاسی تحریک سمجھا جائے تو اس کی مقصد ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک ایسے ریاستی تصور کی جدوجہد تھی جس میں مسلمان اپنی تہذیبی شناخت، سیاسی آزادی اور معاشی خودمختاری کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ قائداعظم محمد علیؒ جناح نے پاکستان کو کبھی محض ایک جغرافیائی اکائی کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ وہ اسے ایک ایسی جدید، آئینی اور جمہوری ریاست بنانا چاہتے تھے جہاں قانون کی حکمرانی فرد، جماعت اور حکومت سب پر یکساں نافذ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تقاریر کا مطالعہ کرنے سے ایک ایسے مدبر سیاست دان کی تصویر سامنے آتی ہے جو جذباتی نعروں کے بجائے آئینی اصولوں، انتظامی نظم اور قومی کردار کو ریاست کی کامیابی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ قائداعظمؒ کے چودہ نکات کو عام طور پر صرف ایک تاریخی دستاویز سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے، حالانکہ اگر انہیں غور سے پڑھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ برصغیر کے پیچیدہ سیاسی مسئلے کا ایک آئینی حل پیش کرتے تھے۔ انہوں نے صوبائی خودمختاری، وفاقی نظام، اقلیتوں کے حقوق، مذہبی آزادی، نمائندگی میں توازن اور آئینی ضمانتوں پر زور دیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ بعدازاں پاکستان میں جن مسائل نے بار بار سر اٹھایا، مرکز اور صوبوں کے اختیارات، وفاق کی نوعیت، اقلیتوں کا تحفظ اور آئینی بالادستی، ان سب کی جھلک قائداعظم کے انہی نکات میں پہلے سے موجود تھی۔ گویا انہوں نے آنے والی صدی کے سیاسی چیلنجز کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔

مارچ 1940 کی قراردادِ لاہور بھی اسی سیاسی ارتقا کا منطقی نتیجہ تھی۔ اس قرارداد کو بعد میں "قراردادِ پاکستان" کا نام دیا گیا، لیکن اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلم اکثریتی علاقوں کو ایسی خودمختار اکائیاں حاصل ہوں جہاں وہ اپنے سیاسی، معاشی اور ثقافتی مستقبل کا فیصلہ خود کر سکیں۔ اس قرارداد میں نہ انتقام کی زبان تھی، نہ کسی قوم سے نفرت کا اظہار، بلکہ ایک آئینی اور سیاسی مطالبہ تھا جسے جمہوری جدوجہد کے ذریعے منوانے کی کوشش کی گئی۔ یہی قائداعظم کی سیاست کا بنیادی وصف تھا کہ انہوں نے بندوق یا تشدد نہیں بلکہ دلیل، قانون اور مذاکرات کو اپنی طاقت بنایا۔

پاکستان کے قیام کے بعد قائداعظم کی سب سے زیادہ حوالہ دی جانے والی تقریر 11 اگست 1947 کو دستور ساز اسمبلی سے خطاب ہے۔ اس تقریر کو مختلف ادوار میں مختلف زاویوں سے دیکھا گیا، لیکن اگر اسے مکمل تناظر میں پڑھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ قائداعظم ایک ایسی ریاست کے خواہاں تھے جہاں ریاست اور شہری کے درمیان تعلق کی بنیاد مذہبی شناخت نہیں بلکہ مساوی شہریت ہو۔ ان کے الفاظ کہ "آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، آپ اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں" دراصل اس اصول کی وضاحت کرتے ہیں کہ ریاست کا اولین فریضہ شہری کے بنیادی حقوق کا تحفظ ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ پاکستان کی نظریاتی بنیاد سے دستبردار ہو گئے تھے، بلکہ وہ یہ واضح کر رہے تھے کہ ایک جدید ریاست اپنے تمام شہریوں کو قانون کی نظر میں برابر سمجھتی ہے۔ اسی طرح 25 جنوری 1948 کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان کا نظامِ انصاف غیر جانبدار، شفاف اور قانون پر مبنی

ہونا چاہیے۔ان کے نزدیک اگر عدالتیں آزاد، انتظامیہ دیانت دار اور سیاسی قیادت ذمہ دار ہو تو ریاست کو ترقی وخوشحالی کے حصول سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ ورنہ بہترین آئین بھی محض ایک کاغذی دستاویز بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ الفاظ آج بھی اسی شدت سے ہماری توجہ چاہتے ہیں، کیونکہ پاکستان کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ آئین، اداروں اور اختیارات کی کشمکش میں گزرا ہے۔

قائداعظم نے بارہا نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے تعلیم، محنت اور دیانت کو قومی ترقی کا ذریعہ قرار دیا۔ان کے نزدیک پاکستان کی اصل دولت سونا، چاندی یا معدنی وسائل نہیں بلکہ تعلیم یافتہ، باکردار اور باصلاحیت انسان تھے۔تاہم ریاست سازی کا سب سے بڑا امتحان قائداعظم کی وفات کے بعد شروع ہوا۔صرف تیرہ ماہ بعد، ستمبر 1948 میں، نوزائیدہ ریاست اپنے بانی سے محروم ہوگئی۔ یہ نقصان محض ایک شخصیت کا نہیں تھا بلکہ ایک ایسے رہنما کا تھا جو سیاسی اختلافات سے بالاتر ہو کر قومی وحدت کی علامت بن چکا تھا۔محض تین برس بعد لیاقت علی خان کی شہادت نے اس خلا کو مزید گہرا کر دیا۔نئی ریاست کے پاس نہ وہ قیادت رہی جو مختلف اداروں کو ایک سمت دے سکتی، نہ وہ سیاسی استحکام جو ایک نوزائیدہ ملک کے لیے ناگزیر تھا۔

یہیں سے پاکستان میں ریاست اور سیاست کے درمیان طاقت کا توازن تبدیل ہونا شروع ہوا۔ چونکہ آئین ابھی تک تشکیل نہیں پا سکا تھا، اس لیے بیوروکریسی اور دیگر ریاستی ادارے بتدریج زیادہ طاقتور ہوتے گئے، جبکہ سیاسی جماعتیں اندرونی اختلافات، علاقائی مفادات

اور قیادت کے بحران کا شکار رہیں۔1947 سے 1956 تک آئین سازی کا فقدان صرف ایک انتظامی ناکامی نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ سے ریاستی ستون غیر یقینی کا شکار بھی ہو گئے تھے، جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہ سوال بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ آخر وہ قوم جس نے آزادی کے لیے مثالی اتحاد کا مظاہرہ کیا، آزادی کے بعد ایک مضبوط قومی بیانیہ کیوں تشکیل نہ دے سکی؟ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ تحریکِ پاکستان کا مشترکہ مقصد آزادی حاصل کرنا تھا، لیکن آزادی کے بعد اس مقصد کی جگہ لینے والا کوئی متفقہ قومی ایجنڈا تشکیل نہ پا سکا۔ مختلف سیاسی قوتوں نے اپنے اپنے تصورات پیش کیے، مگر قومی اتفاقِ رائے پیدا نہ ہو سکا۔ یوں "پاکستان کیسے بنا؟" کا جواب تو قوم کے پاس تھا، لیکن "پاکستان کو کیسا بنانا ہے؟" اس سوال پر ہم تقسیم ہوتے چلے گئے۔

قومی ریاستیں صرف سرحدوں سے نہیں بنتیں، بلکہ مشترکہ اداروں، مساوی انصاف، مشترکہ معاشی نظام اور یکساں شہریت کے احساس سے تشکیل پاتی ہیں۔ اگر کسی ملک میں شہری کی شناخت اس کی صلاحیت کے بجائے اس کے صوبے، زبان، برادری یا طبقے سے متعین ہونے لگے تو قوم سازی کا عمل تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی وقت کے ساتھ یہی مسئلہ نمایاں ہوتا گیا۔ قومی شناخت کے بجائے علاقائی اور گروہی شناختیں مضبوط ہوتی گئیں، اور ریاست ان کے درمیان ایک متوازن رشتہ قائم کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ یہ کہنا انصاف کے تقاضوں سے متصادم ہوگا کہ پاکستان بطور ریاست اور پاکستانی بطور قوم دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا نہیں منوا سکے۔ ایٹمی صلاحیت، دفاعی استحکام، زرعی پیداوار میں اضافہ، انفراسٹرکچر کی تعمیر، صحت اور ٹیکنالوجی کے بعض شعبوں میں نمایاں پیش رفت، اور لاکھوں باصلاحیت نوجوانوں کی کامیابیاں اس ملک کے روشن پہلو ہیں۔ پاکستان نے وہ حاصل کر دکھایا کہ دنیا تو حیران ہو چکی ہے مگر یہ پاکستانی قوم کی صلاحیتوں اور قدرتی وسائل سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ان کامیابیوں کے باوجود قوم سازی کا بنیادی سوال ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہو سکا۔ یہی وہ سوال ہے جو پاکستان کی آئندہ تاریخ کا تعین کرے گا۔

ریاستیں ایک دن میں وجود میں آسکتی ہیں، مگر قومیں صدیوں میں بنتی ہیں۔ پاکستان کا سب سے بڑا المیہ شاید یہی رہا کہ ہم نے ریاست (State) کے قیام کو قوم (Nation) کی تکمیل سمجھ لیا، حالانکہ یہ دو الگ مراحل تھے۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان ایک آزاد ریاست ضرور بن گیا، مگر "پاکستانی قوم" کی تشکیل کا عمل ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ افسوس کہ آزادی کے بعد ہمارے سیاسی فیصلوں، آئینی تعطل، معاشی ناہمواری اور سماجی تقسیم نے اس عمل کو مضبوط کرنے کے بجائے بارہا کمزور کیا۔ آج جب ہم اپنے ماضی کا جائزہ لیتے ہیں تو سوال صرف یہ نہیں کہ پاکستان کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ یہ بھی ہے کہ ہم ان مشکلات کا کس حد تک مقابلہ کیا اور ان بحرانوں سے سیکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔

قوم سازی کی بنیاد مشترکہ آئین، یکساں قانون، انصاف، معاشی مواقع اور مشترکہ قومی بیانیے پر استوار ہوتی ہے۔ پاکستان میں ان

تمام عناصر کی تشکیل میں تاخیر ہوئی۔ جمہوریت صرف انتخابات کا نام نہیں بلکہ برداشت، مکالمے اور قومی مفاد پر اتفاقِ رائے کا نام ہے۔ پاکستان میں سیاسی جماعتیں عوامی نمائندگی کا اہم ذریعہ ضرور رہیں، مگر اکثر اوقات ان کے درمیان اختلافات قومی پالیسی پر اتفاق سے زیادہ گہرے ثابت ہوئے۔ اقتدار کی منتقلی کو ہمیشہ معمول کا جمہوری عمل نہیں بننے دیا گیا، اور ہر سیاسی بحران نے ریاستی اداروں کو بھی متاثر کیا۔ نتیجتاً خارجہ پالیسی، معیشت، تعلیم اور قومی ترقی جیسے بنیادی معاملات بھی سیاسی تنازع کا حصہ بنتے رہے۔ 1947 کے بعد تقریباً نو برس تک ملک مستقل آئین سے محروم رہا۔ اس دوران عبوری انتظامات، گورنر جنرل کے غیر معمولی اختیارات اور سیاسی عدم استحکام نے ریاستی ڈھانچے کو غیر یقینی کیفیت میں رکھا۔ 1956 کا آئین بالآخر نافذ ہوا، مگر وہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ 1958 میں مارشل لا نے یہ تاثر مضبوط کیا کہ سیاسی مسائل کا حل جمہوری ارتقا کی بجائے غیر جمہوری مداخلت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہی روایت بعد کی دہائیوں میں بھی مختلف صورتوں میں دہرائی گئی اور ادارہ جاتی ارتقا کا عمل بار بار منقطع ہوتا رہا۔

اقوام کی تاریخ میں ایسے لمحات بارہا آتے ہیں جب انہیں یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا وہ اپنے ماضی کے بوجھ تلے دب کر رہ جائیں گی یا اپنی غلطیوں کو مستقبل کی تعمیر کا زینہ بنائیں گی۔ پاکستان آج ایسے ہی ایک فیصلہ کن تاریخی موڑ پر کھڑا ہے۔ قیامِ پاکستان کو تقریباً آٹھ دہائیاں بیت چکی ہیں۔ اس عرصے میں ملک نے جنگیں بھی دیکھیں، آئین بھی بنائے، آئین ٹوٹتے بھی دیکھے، جمہوریت بھی دیکھی، آمریت بھی برداشت کی، معاشی ترقی کے ادوار بھی آئے اور شدید بحران بھی۔ لیکن ایک سوال مسلسل ہمارے سامنے کھڑا رہا کہ کیا ہم نے وہ ریاست تعمیر کی جس کا تصور قائداعظم محمد علیؒ جناح نے پیش کیا تھا، یا ہم ابھی تک ریاست سازی کے ابتدائی مرحلے ہی میں تذبذب ہیں؟

کسی بھی قوم کی پائیدار ترقی کا انحصار صرف اس کے قدرتی وسائل پر نہیں بلکہ اس کے اداروں کی مضبوطی، پالیسیوں کے تسلسل اور قومی کردار پر ہوتا ہے۔ دنیا کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جاپان، جرمنی، جنوبی کوریا، سنگاپور اور ملائیشیا جیسے ممالک نے اپنی ترقی کی بنیاد معدنی دولت پر نہیں بلکہ انسانی سرمایہ، معیاری تعلیم، مضبوط اداروں اور قانون کی بالادستی پر رکھی۔ پاکستان کے پاس ان ممالک سے کہیں زیادہ زرعی زمین، نوجوان آبادی، معدنی وسائل اور جغرافیائی اہمیت موجود ہے، مگر یہ تمام وسائل اس وقت تک قومی طاقت میں تبدیل نہیں ہو سکتے جب تک ریاست اپنی ترجیحات کو واضح نہ کرے۔

اس تمام بحث میں ایک پہلو ایسا بھی ہے جس پر نسبتاً کم توجہ دی جاتی ہے، اور وہ ہے قومی کردار۔ آئین بہترین ہو، ادارے مضبوط ہوں، وسائل وافر ہوں، لیکن اگر معاشرے میں قانون کی پاسداری، دیانت، برداشت، میرٹ اور اجتماعی ذمہ داری کا احساس موجود نہ ہو تو ترقی کا خواب ادھورا رہ جاتا ہے۔ قومیں صرف حکمرانوں کے فیصلوں سے نہیں بلکہ اپنے شہریوں کے رویوں سے بھی بنتی ہیں۔ ٹیکس ادا کرنا، قانون کی پابندی کرنا، اختلافِ رائے کو برداشت کرنا، قومی املاک کا احترام کرنا اور اپنے فرائض کو حقوق جتنی اہمیت دینا بھی حب الوطنی کا حصہ ہے۔

قائداعظم نے قوم سے بارہا یہی مطالبہ کیا تھا کہ پاکستان کو صرف حکومت نہیں بلکہ عوام بھی اپنے کردار سے مضبوط بنائیں۔

آج جب ہم 14 اگست مناتے ہیں تو یہ دن محض جشن، آتش بازی، سبز ہلالی پرچموں اور ملی نغموں تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ آزادی کی اصل روح یہ ہے کہ ہم ہر سال خود سے یہ سوال کریں کہ کیا ہم نے گزشتہ برس پاکستان کو بہتر بنایا یا نہیں؟ کیا ہماری سیاست زیادہ بالغ ہوئی؟ کیا ہمارے ادارے زیادہ مضبوط ہوئے؟ کیا ہمارے اسکول بہتر ہوئے؟ کیا ہماری عدالتوں پر عوام کا اعتماد بڑھا؟ کیا ہماری معیشت زیادہ خودمختار ہوئی؟ اگر ان سوالات کے جواب تلاش کیے بغیر صرف جشن منایا جائے تو آزادی کی روح کے منافی ہے۔ جب پاکستان 2047 میں اپنی آزادی کی پہلی صدی مکمل کرے گا تو اس وقت کی نسلیں ہمیں ہمارے نعروں سے نہیں بلکہ ہمارے فیصلوں سے یاد کریں گی۔ وہ یہ نہیں پوچھیں گی کہ ہم نے یومِ آزادی کیسے منایا، بلکہ یہ جاننا چاہیں گی کہ کیا ہم نے وطن عزیز کو ایک مضبوط، خوشحال اور باوقار ریاست میں تبدیل کیا یا نہیں۔ 14 اگست صرف ایک تاریخ نہیں، ایک مسلسل ذمہ داری کا نام ہے۔ آزادی ایک حاصل شدہ نعمت ہے، مگر ایک عظیم ریاست کی تعمیر ایک ایسا فرض ہے جو ہر نسل کو نئی سنجیدگی، نئی بصیرت اور نئے عزم کے ساتھ ادا کرنا ہوگا۔

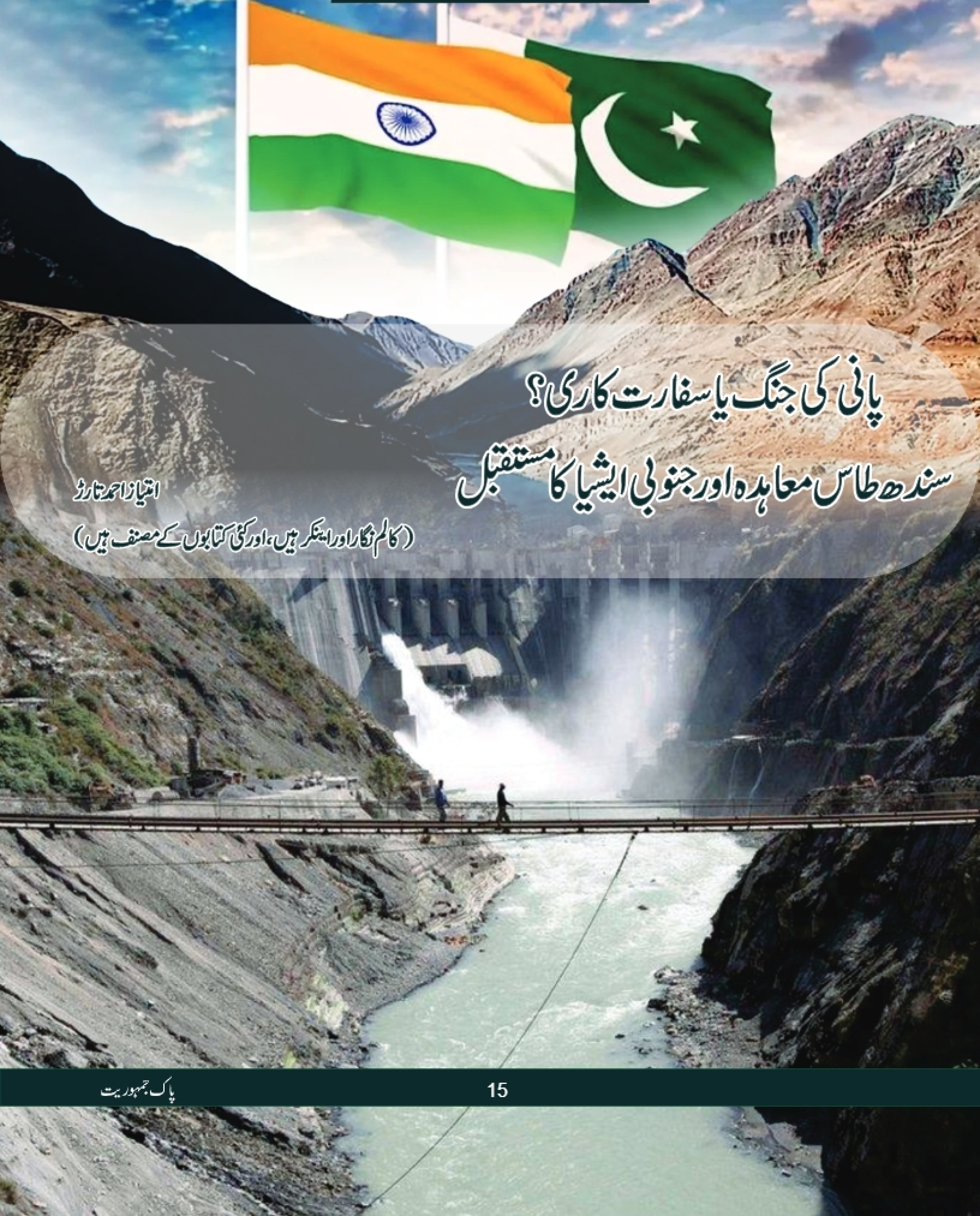

پانی کی جنگ یا سفارت کاری؟
سندھ طاس معاہدہ اور جنوبی ایشیا کا مستقبل

امتیاز احمد تارڑ
(کالم نگار اور اینکر ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں)

پانی جسے صدیوں تک محض ایک قدرتی نعمت اور زندگی کی بنیادی ضرورت سمجھا جاتا رہا، اکیسویں صدی میں قومی سلامتی، معیشت اور خارجہ پالیسی کا ایک مرکزی جزو بن چکا ہے۔ دنیا بھر میں آبادی میں تیزی سے اضافہ، موسمیاتی تبدیلی کے مہلک اثرات، گلیشیئرز کا پگھلنا، بارشوں کے غیر متوازن اور غیر متوقع نظام اور بڑھتی ہوئی زرعی و صنعتی ضروریات نے پانی کو محض ایک وسیلہ نہیں بلکہ ریاستوں کے وجود اور بقا سے جڑا ہوا مسئلہ بنا دیا ہے۔

جنوبی ایشیا کا دنیا کے گنجان ترین اور آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ حساس خطوں میں شمار ہوتا ہے، اس حقیقت سے مبرا نہیں۔ اس خطے میں پانی کی سیاست، سفارت کاری اور تنازع کی سب سے نمایاں اور تاریخی مثال پاکستان اور بھارت کے درمیان طے پانے والا سندھ طاس معاہدہ ہے، جو گزشتہ چھ دہائیوں سے زائد عرصے سے دونوں ممالک کے درمیان دریاؤں کے پانی کی تقسیم کا بنیادی قانونی اور ادارہ جاتی ڈھانچہ فراہم کرتا آیا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کی تاریخ کبھی ہموار نہیں رہی۔ دونوں ممالک نے ایک سے زائد جنگیں لڑی ہیں، سرحدوں پر کشیدگی ایک مستقل حقیقت رہی ہے، دہشت گردی کے الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ چلتا رہا ہے اور سیاسی اختلافات کبھی کم نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود ایک عجیب مگر قابل غور بات یہ ہے کہ سندھ طاس معاہدہ ان تمام حالات کے باوجود ایک طویل

عرصے تک قائم ودائم رہا اور اسے بین الاقوامی سطح پر پانی کی تقسیم کے حوالے سے ایک کامیاب ترین معاہدے کی حیثیت حاصل رہی۔

تاہم حالیہ برسوں میں اس معاہدے کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگنا شروع ہو گئے ہیں۔ بھارت کی جانب سے مغربی دریاؤں پر تعمیر کیے جانے والے متعدد آبی و پن بجلی منصوبے، دونوں ممالک کے درمیان بڑھتی ہوئی باہمی بداعتمادی اور علاقائی سیاسی کشیدگی نے یہ خدشہ جنم دیا ہے کہ آیا مستقبل میں پانی جنوبی ایشیا میں تعاون کا ذریعہ بنے گا یا پھر ایک نئے اور خطرناک تنازع کی بنیاد۔ اس بحث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ جانا جائے کہ سندھ طاس معاہدہ دراصل ہے کیا اور یہ کن حالات میں وجود میں آیا۔

برصغیر کی تقسیم 1947 میں ہوئی، مگر اس تقسیم نے صرف زمین ہی نہیں بلکہ دریاؤں کے نظام کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا۔ سندھ طاس کا نظام، جس میں سندھ، جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج جیسے دریا شامل ہیں، صدیوں سے برصغیر کے زرعی اور معاشی نظام کی ریڑھ کی ہڈی رہا ہے۔ تقسیم کے بعد جب سرحدیں کھینچی گئیں تو ان دریاؤں کے منبع اور بالائی حصے زیادہ تر بھارت کے زیرِ انتظام علاقوں میں آ گئے، جبکہ پاکستان، جو زرعی اعتبار سے انہی دریاؤں پر انحصار کرتا تھا، نچلے حصے میں واقع ہوا۔ یہ ایک ایسی صورتحال تھی جس میں پانی کا کنٹرول جغرافیائی اتفاق سے ایک فریق کے ہاتھ میں چلا گیا، جبکہ دوسرا فریق اسی پانی پر اپنی بقا کے لیے مکمل طور پر منحصر تھا۔ اس صورتحال کی سنگینی 1948 میں ہی واضح ہو گئی جب بھارت نے مشرقی دریاؤں سے پاکستان جانے والے بعض نہری نظاموں کا پانی عارضی طور پر روک دیا۔ اس اقدام نے پاکستان میں شدید تشویش اور خوف و ہراس پیدا کر دیا، کیونکہ اس وقت بھی پاکستان کی زراعت اور خوراک کی پیداوار کا بڑا حصہ انہی دریاؤں سے سیراب ہونے والی زمینوں پر منحصر تھا۔ اس واقعے نے دونوں ممالک کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ پانی کی تقسیم کے کسی مستقل اور قانونی حل کی جانب پیش قدمی کریں۔ اگلے کئی برسوں تک دونوں ممالک کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا، جس میں عالمی بینک نے ایک اہم اور فیصلہ کن ثالثی کا کردار ادا کیا۔ عالمی بینک کی کوششوں کے نتیجے میں طویل اور پیچیدہ گفت و شنید کے بعد بالآخر 19 ستمبر 1960 کو کراچی میں ایک تاریخی معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس موقع پر پاکستان کی جانب سے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور بھارت کی جانب سے وزیرِاعظم جواہر لعل نہرو نے عالمی بینک کے تعاون اور نگرانی میں، سندھ طاس معاہدے پر دستخط کیے۔ یہ لمحہ جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے، حالانکہ یہ دو ایسے ممالک کے درمیان طے پانے والا معاہدہ تھا، جن کے درمیان صرف تیرہ برس قبل ایک خونریز جنگ لڑی جا چکی تھی اور جن کے تعلقات بنیادی طور پر عدم اعتماد کی بنیاد پر استوار تھے۔

معاہدے کی بنیادی ساخت نہایت سادہ مگر مؤثر انداز میں ترتیب دی گئی۔ چھ بڑے دریاؤں کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ مشرقی دریا، یعنی راوی، بیاس اور ستلج، کا تقریباً مکمل استعمال بھارت کے حوالے کیا گیا، جبکہ مغربی دریا، یعنی سندھ، جہلم اور چناب، کا بنیادی حق پاکستان کو دیا گیا۔ اس تقسیم کے پیچھے یہ منطق کارفرما تھی کہ چونکہ مشرقی دریا بھارتی علاقوں سے گزر کر پاکستان میں داخل ہوتے تھے اور ان پر

پہلے سے بھارتی ڈھانچہ موجود تھا، اس لیے انہیں بھارت کے حوالے کر دیا گیا، جبکہ مغربی دریا، جو پاکستان کی زراعت کے لیے حیاتی اہمیت رکھتے تھے، پاکستان کے حصے میں آئے۔ تاہم اس تقسیم کے باوجود بھارت کو مغربی دریاؤں پر بھی کچھ محدود نوعیت کے حقوق دیے گئے، جن میں پن بجلی کی پیداوار، گھریلو ضروریات کی تکمیل اور مخصوص زرعی مقاصد شامل تھے۔ اس اجازت کے ساتھ ایک بنیادی شرط جڑی ہوئی تھی، یعنی بھارت کو دریا کے قدرتی بہاؤ میں کوئی ایسی نمایاں تبدیلی نہیں لانی تھی جس سے پاکستان کو نقصان پہنچے۔ یہی شرط بعد کے برسوں میں کئی

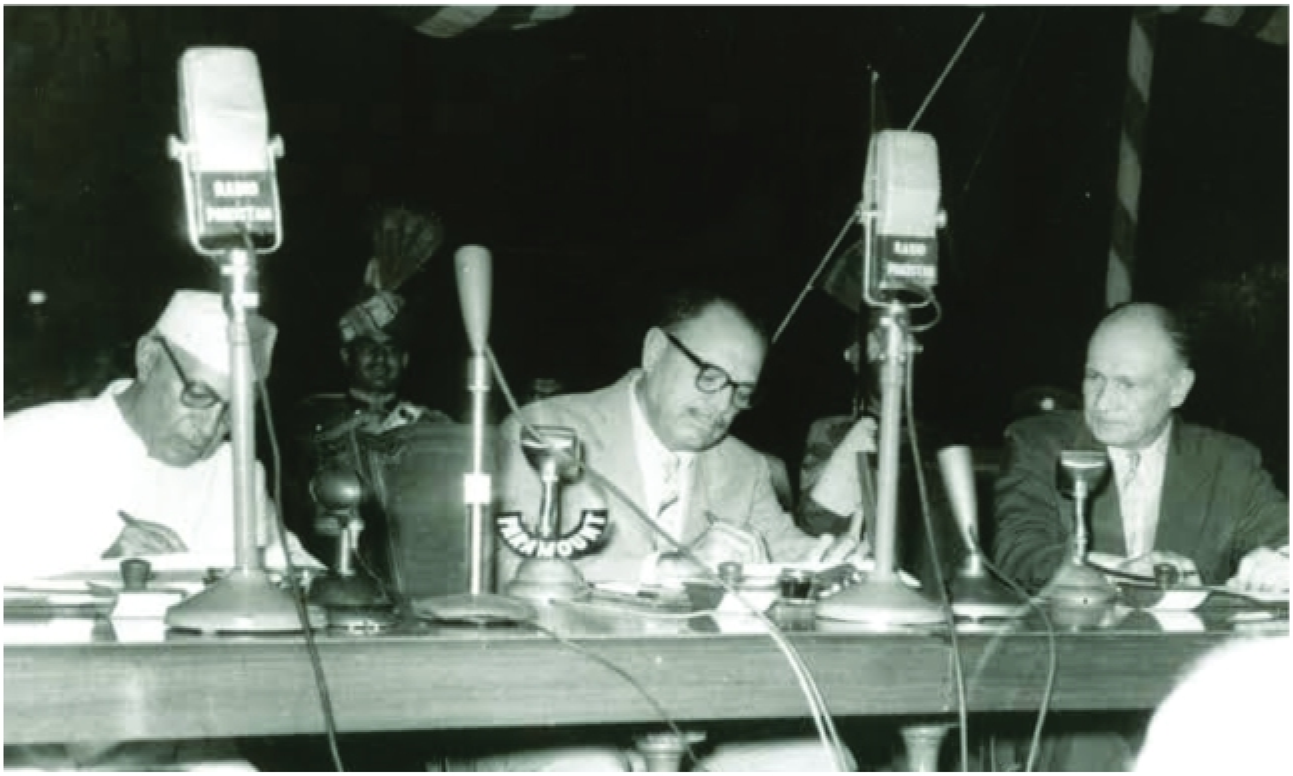

تنازعات کی جڑ بنی۔ معاہدے کے تحت دونوں ممالک نے ایک مستقل ادارہ قائم کیا جسے مستقل سندھ کمیشن یا پرمننٹ انڈس کمیشن کا نام دیا گیا۔ اس کمیشن میں دونوں جانب سے ایک ایک کمشنر مقرر کیا جاتا ہے، جن کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ سالانہ بنیادوں پر ملاقاتیں کریں، ایک دوسرے کے ساتھ متعلقہ ڈیٹا کا تبادلہ کریں، نئے آبی منصوبوں کے بارے میں بروقت معلومات فراہم کریں، ابتدائی سطح پر پیدا ہونے والے اعتراضات کو حل کرنے کی کوشش کریں اور معاہدے پر عمل درآمد کی نگرانی کریں۔ یہ کمیشن دراصل ایک ایسا فورم فراہم کرتا ہے جہاں دونوں ممالک اپنے اختلافات کو براہ راست بات چیت کے ذریعے حل کر سکیں، بغیر اس کے کہ معاملہ کشیدگی کی نچلی سطح تک پہنچے۔ اگر کمیشن کسی مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہے تو معاہدے میں یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ معاملہ ایک غیر جانبدار ماہر یا پھر بین الاقوامی ثالثی عدالت کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ یہ ادارہ جاتی ڈھانچہ ہی دراصل وہ بنیادی وجہ ہے جس کی بدولت یہ معاہدہ اتنی دہائیوں تک، شدید سیاسی کشیدگی اور جنگوں کے

باوجود، برقرار رہ سکا۔ پاکستان کے لیے اس معاہدے کی اہمیت کو سمجھنا ہو تو اس کا اندازہ ایک اعداد و شمار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، یعنی پاکستان کی تقریباً اسی فیصد زرعی زمین سندھ طاس نظام کے دریاؤں سے سیراب ہوتی ہے۔ کپاس، گندم، چاول، گنا، سبزیاں اور پھل، غرض یہ کہ ملک کی بیشتر زرعی پیداوار انہی دریاؤں کے پانی پر منحصر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کی معیشت، اس کا غذائی تحفظ، اس کی دیہی آبادی کا روزگار اور معاش اور اس کی توانائی کی پیداوار کا بڑا حصہ اسی آبی نظام سے جڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں پانی کے ہر قطرے کو محض ایک زرعی یا معاشی مسئلہ نہیں بلکہ ایک قومی سلامتی کا معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ جس ملک کی معیشت کا انحصار اس حد تک ایک مخصوص آبی نظام پر ہو، اس کے لیے اس نظام میں کسی بھی قسم کی مداخلت یا تبدیلی وجودی خطرہ تصور کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو دہائیوں میں بھارت کی جانب سے مغربی دریاؤں پر تعمیر کیے جانے والے متعدد پن بجلی اور آبی منصوبے پاکستان میں شدید تشویش اور اعتراضات کا باعث بنتے رہے ہیں۔

ان منصوبوں میں سب سے پہلے بگلیہار ڈیم کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو دریائے چناب پر جموں و کشمیر میں تعمیر کیا گیا اور جس کی صلاحیت تقریباً نو سو میگاواٹ ہے۔ پاکستان نے اس منصوبے پر یہ اعتراض اٹھایا کہ اس کا ڈیزائن ایسا ہے کہ بھارت پانی کے بہاؤ پر غیر ضروری اثر ڈال سکتا ہے اور یہ کہ اس کی تعمیر معاہدے کی روح سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح کشن گنگا منصوبہ، جسے پاکستان میں نیلم کے نام سے جانا جاتا ہے، بھی ایک بڑا تنازع بنا۔ اس منصوبے کی صلاحیت تقریباً تین سو تیس میگاواٹ ہے، پاکستان کا موقف یہ تھا کہ اس سے پاکستان کا اپنا نیلم جہلم ہائیڈرو پاور منصوبہ متاثر ہوگا، کیونکہ اگر بھارت پہلے پانی کا استعمال کر لے تو پاکستان کے منصوبے کو ناکافی پانی ملے گا۔ یہ تنازع اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ معاملہ بین الاقوامی ثالثی عدالت تک پہنچا، جس نے بالآخر بھارت کو منصوبہ مکمل کرنے کی اجازت تو دے دی، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ ایک کم از کم مقدار میں پانی کا بہاؤ ہر صورت برقرار رکھے گا تاکہ پاکستان کے منصوبے کو نقصان نہ پہنچے۔ اسی طرح رتلے ہائیڈرو پاور منصوبہ، جو بھی دریائے چناب پر تعمیر کیا جا رہا ہے اور جس کی صلاحیت تقریباً آٹھ سو پچاس میگاواٹ ہے، پاکستان کی جانب سے شدید اعتراضات کا نشانہ بنا۔ پاکستان کا موقف یہ رہا کہ اس منصوبے کا ڈیزائن بھی معاہدے کی روح سے میل نہیں کھاتا۔ اسی فہرست میں "پاکل دل" منصوبہ بھی شامل ہے، جو دریائے چناب کے معاون دریا مارو سودر پر تعمیر کیا جا رہا ہے اور جس کی صلاحیت تقریباً ایک ہزار میگاواٹ ہے اور یہ منصوبہ بھی پاکستان کی تشویش کا مسلسل باعث رہا ہے۔ اس کے علاوہ لوئر کلنائی منصوبہ، جو دریائے کلنائی پر تعمیر کیا گیا اور جس کی صلاحیت تقریباً اڑتالیس میگاواٹ ہے، پر بھی پاکستان نے تکنیکی نوعیت کے اعتراضات اٹھائے۔ ان کے علاوہ بھارت نے جموں و کشمیر میں کرواں، سولکوٹ، کیرو اور کئی دیگر پن بجلی منصوبے بھی شروع کیے، جن کا بنیادی مقصد بجلی کی پیداوار اور آبی وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہے۔

پاکستان کا مجموعی موقف ان تمام منصوبوں کے حوالے سے یہ رہا ہے کہ اگرچہ معاہدہ بھارت کو مغربی دریاؤں پر محدود نوعیت کے پن بجلی منصوبوں کی اجازت دیتا ہے، مگر ایسے ڈیزائن قابل قبول نہیں جو مستقبل میں بھارت کو پانی کے بہاؤ پر کنٹرول حاصل کرنے کی صلاحیت

فراہم کریں۔ اس تناظر میں ایک سوال اکثر سیاسی اور عوامی بحث کا حصہ بنتا ہے، اور وہ یہ کہ کیا بھارت مکمل طور پر پاکستان کی جانب جانے والا پانی روک سکتا ہے۔

یہ سوال خاص طور پر ان لمحات میں شدت اختیار کرتا ہے جب دونوں ممالک کے درمیان سیاسی یا فوجی کشیدگی عروج پر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ صورتحال میں بھارت کے پاس اتنی وسیع ذخیرہ گاہیں یا ڈیم موجود نہیں کہ وہ مغربی دریاؤں کا پانی مکمل طور پر روک سکے۔ مغربی دریاؤں کا بہاؤ اتنا وسیع اور تیز رفتار ہے کہ اسے مکمل طور پر روکنے کے لیے جس قسم کے بڑے ذخائر اور بنیادی ڈھانچے کی ضرورت ہوگی، وہ فی الحال بھارت کے پاس دستیاب نہیں۔

CITY EDITION

THE INDIAN EXPRESS

Largest Combined Net Sales Among All Daily Newspapers in India

NEW DELHI, TUESDAY, SEPTEMBER 20, 1960

INDUS WATERS PACT SIGNED IN KARACHI

New Era Of Happier Relations

EXAMPLE OF CO-OPERATIVE ENDEAVOUR, SAYS NEHRU

Ayub: Historic Event For Whole World

From D. R. MANKEKAR

KARACHI, Sept. 19.

SYMBOL OF NEW TIES

The Cost Of Treaty

Warm But Restrained Welcome To Nehru

POLISH P.M. ARRIVING TODAY

SEVERE BLOW TO RAJASTHAN

Implications Of Treaty

البتہ بھارت کے پاس یہ صلاحیت ضرور موجود ہے کہ وہ پانی کے بہاؤ میں عارضی طور پر تبدیلی لا سکے، محدود مدت کے لیے پانی کو ذخیرہ کر سکے یا نئے منصوبوں کی تعمیر کے ذریعے اپنی انتظامی اور تکنیکی صلاحیت میں اضافہ کر سکے۔ یہ بات اہم ہے کہ دریاؤں کا مکمل رخ موڑنا یا پانی کو مکمل طور پر بند کر دینا نہ صرف معاہدے کی صریح خلاف ورزی ہوگی بلکہ عملی اور تکنیکی اعتبار سے بھی انتہائی مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ اس کے باوجود، سیاسی بیانات اور جذباتی نعروں میں اکثر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ پانی بند کرنا ایک آسان اور فوری اقدام ہے، جو کہ حقیقت سے کافی حد تک مختلف ہے۔ اس پوری بحث میں ایک نیا اور انتہائی سنگین عنصر موسمیاتی تبدیلی کی صورت میں شامل ہو چکا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سندھ طاس معاہدہ 1960 میں اس وقت طے پایا تھا جب موسمیاتی تبدیلی ایک عالمی مسئلے کے طور پر موجود ہی نہیں تھی اور نہ ہی اس وقت کے مذاکرات کاروں نے اس عنصر کو مدنظر رکھا تھا۔ آج کی صورتحال اس سے یکسر مختلف ہے۔ ہمالیہ اور قراقرم کے گلیشیئر، جوان دریاؤں کے پانی کا بنیادی منبع ہیں، تیزی سے پگھل رہے ہیں۔ کبھی خطے میں شدید اور تباہ کن سیلاب آتے ہیں تو کبھی طویل خشک سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بارشوں کا روایتی نظام بھی بدل چکا ہے، جس کی وجہ سے پانی کی دستیابی کا اندازہ لگانا پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ یہ تمام عوامل مل کر ایک ایسی صورتحال پیدا کرتے ہیں جس میں دونوں ممالک کو مستقبل میں نہ صرف سیاسی اختلافات بلکہ ایک مشترکہ موسمیاتی خطرے کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جہاں دونوں ممالک کے مفادات درحقیقت مشترک ہیں، کیونکہ گلیشیئرز کا پگھلنا، سیلاب اور خشک سالی کسی ایک ملک تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ پورے خطے کو متاثر کریں گے۔ اس تمام صورتحال میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ صرف بھارت کو ہر مسئلے کا ذمہ دار قرار دینا کافی نہیں اور نہ ہی یہ ایک متوازن یا حقیقت پسندانہ رویہ ہوگا۔

پاکستان کو بھی اپنی داخلی آبی پالیسی پر سنجیدگی سے نظرثانی کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ملک میں پانی کا ایک بہت بڑا حصہ ناقص انتظام کی وجہ سے ضائع ہوتا ہے۔ نہری نظام میں جگہ جگہ رساؤ موجود ہے، جس کی وجہ سے قیمتی پانی زمین میں جذب ہو کر یا بخارات کی صورت میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جدید آبپاشی کے طریقوں کا استعمال ابھی تک انتہائی محدود ہے، جبکہ دنیا کے کئی دیگر ممالک ڈرپ اریگیشن اور دیگر جدید تکنیکوں کے ذریعے پانی کے استعمال کو نمایاں طور پر کم کر چکے ہیں۔ پاکستان میں پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت بھی خطے کے دیگر ممالک کے مقابلے میں کافی کم ہے، جس کی وجہ سے جب زیادہ پانی دستیاب ہوتا ہے تو اسے مستقبل کے استعمال کے لیے محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ زیر زمین پانی کی سطح بھی تیزی سے کم ہو رہی ہے، جو کہ ایک اور سنگین خطرے کی علامت ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مستقبل میں پانی کا معاملہ سفارت کاری کے ذریعے حل ہوگا یا پھر یہ ایک نئے تصادم کی بنیاد بنے گا۔ پانی پر جنگ کا تصور، اگرچہ سیاسی نعروں اور جذباتی بیانات میں کافی مقبول ہو سکتا ہے، مگر حقیقت میں دونوں ممالک کے لیے اس کے نتائج انتہائی تباہ کن ثابت ہوں گے۔ ایک ایسے خطے میں جہاں دونوں ممالک ایٹمی طاقت رکھتے ہیں اور جہاں کروڑوں افراد کا معاش اور بقا انہی دریاؤں پر منحصر ہے، پانی کو تصادم کا ہتھیار بنانا کسی بھی فریق کے مفاد میں نہیں۔

اس کے برعکس پانی کی تقسیم، سیلاب کی پیشگی اطلاع، موسمیاتی ڈیٹا کا تبادلہ، ڈیموں کی تعمیر سے متعلق شفاف معلومات کی فراہمی اور تکنیکی تعاون ایسے شعبے ہیں جہاں مسلسل رابطہ اور بات چیت کشیدگی کو نمایاں طور پر کم کر سکتی ہے۔ بین الاقوامی قوانین اور سرحد پار دریاؤں کے انتظام سے متعلق عالمی اصول بھی یہی تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے دریا، جو ایک سے زیادہ ممالک سے گزرتے ہیں، انہیں تعاون اور باہمی اعتماد کی بنیاد پر ہی مؤثر طریقے سے چلایا جا سکتا ہے، نہ کہ یکطرفہ اقدامات یا دباؤ کے ذریعے۔ اس تناظر میں مستقبل کا راستہ کیا ہونا چاہیے، اس پر غور کرنا

انتہائی ضروری ہے۔ سندھ طاس معاہدہ اگرچہ مکمل یا بے عیب نہیں، اس میں کئی خامیاں اور کمزوریاں موجود ہیں، خاص طور پر موسمیاتی تبدیلی جیسے جدید چیلنجز کے تناظر میں، مگر اس کے باوجود یہ اب بھی جنوبی ایشیا کے استحکام کے لیے ایک انتہائی اہم اور بنیادی ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس معاہدے کو سیاسی دباؤ اور وقتی جذباتی فیصلوں سے بالاتر رکھنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اسی طرح مستقل سندھ کمیشن کو مزید فعال، شفاف اور مؤثر بنانا ضروری ہے تاکہ چھوٹے اختلافات بڑے تنازعات کی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی حل ہو سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، جب بھی کوئی تنازع پیدا ہو تو معاہدے میں موجود قانونی طریقہ کار، یعنی غیر جانبدار ماہرین یا بین الاقوامی ثالثی عدالت کے ذریعے حل تلاش کرنا، کو ترجیح دی جانی چاہیے، بجائے اس کے کہ معاملات کو سیاسی بیان بازی یا میڈیا کے ذریعے شدت دی جائے۔

موسمیاتی تبدیلی کے تناظر میں سائنسی تعاون بڑھانا بھی اسی قدر اہم ہے، کیونکہ دونوں ممالک کے سائنسدان اور ماہرین مل کر گلیشیئرز کی نگرانی، سیلاب کی پیشگوئی اور آبی وسائل کے بہتر انتظام کے حوالے سے قیمتی معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان اپنی داخلی سطح پر ٹھوس اور دیرپا آبی اصلاحات کی جانب پیش قدمی کرے۔ نئے آبی ذخائر کی تعمیر، نہری نظام کی مرمت اور بہتری، پانی کے ضیاع میں نمایاں کمی، اور جدید زرعی ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری، یہ سب ایسے اقدامات ہیں جو پاکستان کو اپنی آبی سلامتی مضبوط بنانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ صرف بیرونی محاذ پر توجہ مرکوز رکھنے کے بجائے اندرونی اصلاحات پر بھی اتنی ہی توجہ دینا ضروری ہے، کیونکہ آبی سلامتی محض

دوسرے ملک کے رویے پر منحصر نہیں ہونی چاہیے بلکہ اپنی داخلی صلاحیتوں پر بھی استوار ہونی چاہیے۔

دوسری جانب بھارت پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے نئے آبی منصوبوں کے بارے میں مکمل اور شفاف معلومات فراہم کرے اور ایسے اقدامات سے گریز کرے، جو معاہدے کی روح کے منافی ہوں اور جن سے عدم اعتماد میں مزید اضافہ ہو۔ اعتماد سازی کے یہ اقدامات دونوں جانب سے یکساں اہمیت رکھتے ہیں، اور کسی ایک فریق کی یکطرفہ کوشش سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔

جنوبی ایشیا کی آنے والی دہائیوں میں پانی محض ایک قدرتی وسیلہ نہیں رہے گا بلکہ یہ خطے میں امن، معاشی ترقی اور علاقائی استحکام کا ایک بنیادی اور فیصلہ کن ستون ثابت ہوگا۔ سندھ طاس معاہدہ اس اہم حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ شدید سیاسی اختلافات، تاریخی دشمنی اور یہاں تک کہ جنگوں کے باوجود بھی مشترکہ مفادات پر مبنی تعاون ممکن ہے، بشرطیکہ دونوں فریق سمجھداری اور تدبر کا مظاہرہ کریں۔ اگر پاکستان اور بھارت پانی کو باہمی دباؤ اور سیاسی بلیک میلنگ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے اسے ایک مشترکہ ذمہ داری اور مشترکہ چیلنج کے طور پر تسلیم کریں، تو یہ معاہدہ آنے والی نسلوں کے لیے امن، خوشحالی اور ترقی کی ایک مضبوط ضمانت بن سکتا ہے۔ لیکن اگر سیاسی کشیدگی اور محاذ آرائی آبی تعاون پر غالب آ گئی، اگر دونوں ممالک نے پانی کو ایک اور محاذ جنگ کے طور پر دیکھنا شروع کر دیا، تو یہ محض ایک دوطرفہ مسئلہ نہیں رہے گا بلکہ پانی کا یہ بحران پاکستان اور بھارت سے آگے بڑھ کر پورے جنوبی ایشیا کے لیے ایک نئے، وسیع اور انتہائی خطرناک تنازع کی بنیاد بن سکتا ہے، جس کے اثرات کروڑوں انسانوں کی زندگیوں، معیشتوں اور خطے کے مجموعی استحکام پر براہ راست مرتب ہوں گے۔ اسی لیے یہ لمحہ تقاضا کرتا ہے کہ پاکستان کی طرح بھارت کے پالیسی ساز، سفارت کار اور عوام اس معاملے کو محض جذباتی نعروں کی بنیاد پر نہیں بلکہ حقیقت پسندی، دور اندیشی اور طویل المدتی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھیں، تا کہ آنے والی نسلیں پانی کی وجہ سے تباہی کے بجائے پانی کی بدولت خوشحالی اور امن دیکھ سکیں۔

سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ اور خواتین کے حقوق

رباب زہرا

(مصنفہ ملکی اور بین الاقوامی امن اور احترام انسانیت کے حوالے سے مختلف اخبارات اور رسائل کے لیے لکھتی ہیں)

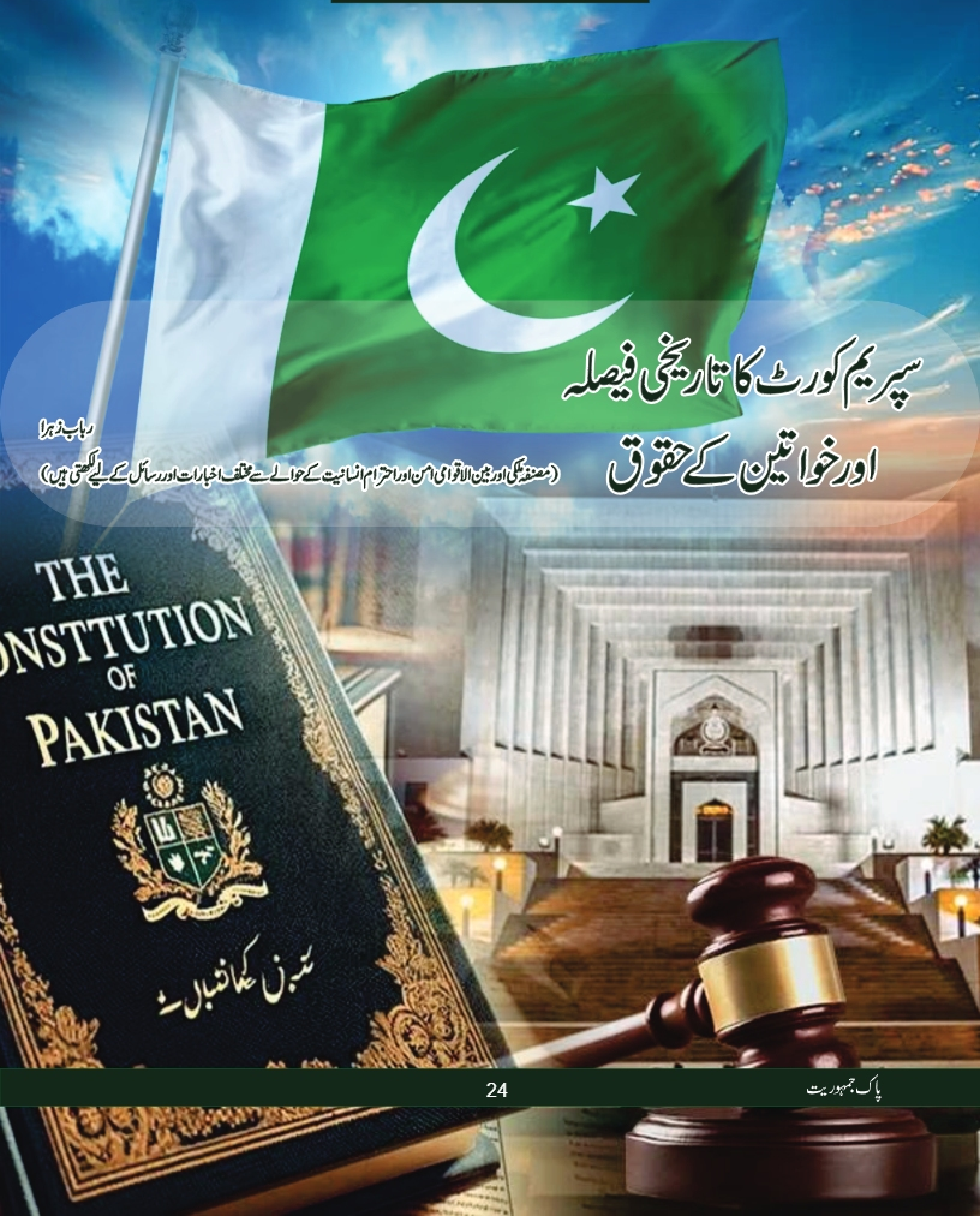

پاکستان کے مردانہ معاشرے میں اعداد وشمار کے مطابق خواتین کی تعداد زیادہ ہے،مگرانسانی حقوق کی تنظیموں کی موجودگی کے باوجود بھی "بنتِ حوا" کا استحصال روایتی انداز میں موجود ہے۔حقوقِ نسواں کے ادارے بھی صرف درشنی معلوم ہوتے ہیں۔ ریاست میں بسنے والوں کی اکثریت مسلمان،کلمہ گو،قرآن وسنت کے پیروکار ہے،لیکن علاقائی اور خاندانی روایات ہی نہیں بلکہ نفع ونقصان کی مصلحت پسندی کے باعث اکثریت ایسےلوگوں کی ہے جومختلف بہانوں سے بیٹیوں کووراثتی حق دینے کی عادی نہیں۔

اسلام اور ریاست "ہبہ" کر کے جائیداد کسی کو دینے پر پابندی عائد نہیں کرتے،لیکن اس کے لیے بھی قواعد وضوابط اور حدود موجود ہیں۔ پھر بھی دیکھنے کو یہی ملتا ہے کہ صرف بیٹیوں کو حقِ وراثت سے محروم رکھنے کے لیے صاحبِ جائیداد والدین اپنی زندگی میں ہی زمین اور جائیداد بیٹوں کے نام "ہبہ" کر دیتے ہیں تاکہ انہیں بیٹیوں کو حصہ نہ دینا پڑے۔منطق یہ دی جاتی ہے کہ بیٹیاں پرایا دھن ہیں،ان کا حقیقی گھر تو ان کے شریکِ حیات کا ہے۔

قیامِ پاکستان سے اب تک لاکھوں ایسے مقدمات اور جھگڑے ریکارڈ پر ہیں جن کی وجہ سے ہزاروں خاندان کبھی نہ ختم ہونے والے مقدمات میں نہ صرف الجھے ہوئے ہیں بلکہ عدالتی نظام کے ہاتھوں نسل در نسل رسوا بھی ہور ہے ہیں۔اس ناانصافی کے باعث انسانی جانیں بھی ضائع ہوئیں۔ایک وقت تھا جب لوگ اپنی خوشیاں رشتہ داروں کے لیے قربان کر دیتے تھے،لیکن اب حالات ایسے بدل گئے ہیں کہ لوگ

خوشیوں کے لیے رشتہ وار قربان کر دیتے ہیں۔ بیٹیوں کی وراثت میں بھی قدم قدم پر ایسا ہی دیکھنے کو ملا۔ ان گنت بیٹیاں اسے نصیب، قسمت اور مقدر سمجھ کر خاموش بیٹھ گئیں، لیکن اللہ پر توکل اور یقین سے سب کچھ ہو جاتا ہے، وہ بھی جس کا کسی نے تصور تک نہ کیا ہو۔

مالکِ کائنات کا فرمان ہے کہ: "تم صبر کی انتہا کرو، میں معجزوں کی انتہا کر دوں گا۔" بس سپریم کورٹ آف پاکستان نے صبر کی پیکر بیٹیوں کے لیے خواتین کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک تاریخی فیصلہ کر دیا، کیونکہ پاکستان میں وراثت کا مسئلہ صرف قانونی تنازع ہرگز نہیں بلکہ ایک سماجی، عوامی اور اخلاقی مسئلہ بھی ہے۔ علاقائی رسومات، خاندانی فیصلوں اور روایتی اندازِ زندگی کے باعث ہر سال خاندانی دباؤ اور اخلاقی رواداری کی آڑ میں خواتین کو ان کی جائز وراثتی ملکیت سے محروم کر دیا جاتا تھا، اور طریق واردات یہی اپنایا جاتا کہ خاندانی رسم و رواج کو بنیاد بنا کر زندگی میں ہی کاغذات کے ذریعے کسی فرد کو جائیداد "ہبہ" کر دی جاتی تھی۔

اسی تناظر میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے ایک ایسا فیصلہ صادر کیا ہے جو صرف قانونی اعتبار سے نہیں بلکہ معاشرتی حوالے سے بھی ایک نیا باب ثابت ہوگا۔ عدالتِ عظمیٰ نے اپنے فیصلے میں واضح کیا ہے کہ "ہبہ" یعنی زندگی میں کسی کو بلا معاوضہ جائیداد دینا مملکت اور اسلامی نظام میں درست ہے، لیکن یہ صرف ذاتی اور زبانی فیصلہ ہونے کے بجائے بنیادی شرائط کا پابند ہوگا۔ ان اصولوں میں جائیداد دینے والے کی آزاد مرضی، وصول کرنے والے کی قبولیت، اور جائیداد کی حقیقی منتقلی شامل ہوگی۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہو تو "ہبہ" قانونی طور پر مشکوک قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ اصول اس لیے بنیاد بنائے گئے ہیں کہ ماضی اور حال میں سینکڑوں ایسے مقدمات منظرِ عام پر آئے ہیں جن میں کسی بھی شخص کے انتقال کے بعد کوئی مبینہ "ہبہ نامہ" سامنے آ گیا، اور اس کے نتیجے میں خصوصاً بیٹیوں اور بہنوں کو ان کے قانونی حقِ وراثت سے محروم کر دیا گیا، حالانکہ جائیداد کسی کو منتقل بھی نہیں کی گئی تھی۔ لہٰذا اب سپریم کورٹ نے تین بنیادی اصولوں پر عدالتوں کو سختی سے عمل درآمد کرنے کا حکم دیتے ہوئے تاکید کی ہے کہ عدالت حقِ وراثت کے مقدمات کا باریک بینی سے جائزہ لے، اور ہر دعویٰ مضبوط شواہد کی بنیاد پر ثابت ہونا چاہیے۔ مطلب یہی ہے کہ اگر کسی نے جائیداد منتقل کیے بغیر روایتی اور رسمی "ہبہ نامہ" بنوا رکھا ہے تو اسے خلافِ قانون قرار دیا جائے۔

اگر فیصلے کا جائزہ لیا جائے تو تینوں بنیادی شرائط بظاہر عام سی ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ "ہبہ نامہ" پر مفت میں کسی دوسرے کے نام جائیداد منتقل کرانا معمولی بات نہیں۔ یہ فیصلہ صرف ایک قانونی نکتہ نہیں بلکہ حقوقِ نسواں کے تحفظ کے لیے بھی انتہائی اہم ہے، کیونکہ رسمی اور روایتی "ہبہ نامہ" کے ذریعے صرف خواتین اور بیٹیوں کا وراثتی حق چھینا جا رہا تھا۔ اس بات سے کوئی انکار کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا، اس لیے کہ پاکستان میں خواتین کی وراثت سے محرومی ایک تلخ حقیقت ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی ادارہ یا تحقیق کار غیر جانبدارانہ سروے کرے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ اوّل تو اکثر لوگ خواتین کو حصہ دیتے ہی نہیں، دوم خواتین سے سماجی دباؤ اور رشتوں کے نام پر بلیک میل کر کے

دستبرداری کے کاغذات پر دستخط کرا لیے جاتے ہیں۔ بلکہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ والدین اپنی زندگی میں ہی تمام جائیدادیں بیٹوں کے نام منتقل کر دیتے ہیں، اور بیٹیاں اس راز سے بے خبر رہتی ہیں، لیکن جونہی والدین دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، راز فاش ہو جاتا ہے کہ بیٹیاں اپنے حقِ وراثت سے نہ صرف محروم ہو چکی ہیں بلکہ انہیں کسی قانونی چارہ جوئی کا حق بھی نہیں رہتا۔

قانون کسی بھی شخص کو اپنی زندگی میں اپنی ملکیت کی جائیداد "ہبہ" کرنے کا حق دیتا ہے، لیکن اگر اس اختیار کو صرف کسی ایک وارث کو ناجائز فائدہ پہنچانے یا دیگر ورثا کو محروم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے تو عدالت ایسے معاملات کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اسی لیے سپریم کورٹ نے شواہد، قبضے اور نیت کی جانچ پڑتال پر خصوصی زور دیا ہے۔ ان معاملات میں مسئلہ صرف قانونی پیچیدگیاں نہیں بلکہ نفاذ اور معاشرتی رویوں کی خامیاں بھی ہیں۔ اکثر خواتین تعلیمی کمی اور آگاہی نہ ہونے کے باعث عدالت تک پہنچ ہی نہیں پاتیں، اور اگر پہنچ جائیں تو انہیں برسوں مقدمات کے لیے دھکے کھانا پڑتے ہیں۔ اس طرح اگر دہائیوں بعد فیصلے ہو بھی جائیں تو حقیقت یہی ہے کہ بہترین فیصلے بھی اپنی حقیقی افادیت کھو دیتے ہیں۔

لہٰذا حالات کا تقاضا ہے کہ حکومت سپریم کورٹ کے اس فیصلے کی بنیاد پر وراثتی نظام کو جدید تقاضوں کے مطابق شفاف بنائے، تاکہ جائیداد کی منتقلی، "ہبہ نامہ" کی رجسٹریشن، اور قبضے کے ریکارڈ کو جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے محفوظ کیا جا سکے، تاکہ جعل سازی کے امکانات اور

گنجائش تقریباً ختم ہو جائے۔ اسی طرح قانونی اصلاحات اور آگاہی کے ذریعے عوامی تربیت کا بھی کوئی مؤثر سلسلہ شروع کیا جائے، تاکہ خواتین اپنے حقوق سے نہ صرف واقف ہو سکیں بلکہ خاندان بھی قانون کی اصل روح سے آشنا ہو کر اسے اپنے اور خواتین کی سہولت کے لیے استعمال کر سکیں۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ "ہم اور آپ" بطور مسلمان بھی اپنا فرض ادا کرنے کو تیار نہیں۔ دینِ حق اسلام نے چودہ سو سال پہلے خواتین اور بیٹیوں کو وراثت کا حق دے دیا تھا۔ نسخہ کیمیا قرآنِ مجید، احادیث اور تفاسیر کی صورت میں لاتعداد کتابیں بھی موجود ہیں، پھر بھی جدید زمانے میں رہتے ہوئے ہماری سوچ اصولوں کی بجائے پتھر کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے ہماری معاشرتی روایات آج بھی اس حق کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

لہٰذا سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ صرف ایک مثبت اور اہم پیش رفت ہی سمجھا جائے۔ یہ منزل نہیں بلکہ ایک سنگِ میل ہے۔ اس پر عمل درآمد کرانے اور عوامی سطح پر اس کے حقیقی نتائج حاصل کرنے کے لیے ابھی حکومتی اقدامات کی ضرورت ہے، کیونکہ ہم اسے آسانی سے ہضم کرنے کے موڈ میں نہیں۔ حکومتیں اصلاحات کرتی ہیں، پارلیمنٹ قانون سازی کرتی ہے، اور عدالتیں ان کا تحفظ کر کے سہولت کاری مہیا کرتی ہیں۔ اس فیصلے میں عدالت نے ایک تاریخی فیصلہ کر دیا، اب حکومت نے ایسے انتظامات کرنے ہیں کہ اس کے بنیادی تینوں اصولوں پر من و عن عمل کیا جائے۔

یہی نہیں، اگر ہم واقعی خواتین کو ان کا آئینی، قانونی اور شرعی حق دینا چاہتے ہیں تو عدالتی فیصلہ تو ہو چکا، مگر اس پر عمل درآمد کے لیے خاندانوں کو اپنی پرانی روش بدلنی ہوگی۔ لیکن ایسا تبھی ممکن ہوگا جب ریاست مؤثر نفاذ کو یقینی بنائے اور ایسے سخت اقدامات کرے کہ معاشرے کو تسلیم کرنا پڑے کہ وراثت احسان ہرگز نہیں بلکہ ایک ناقابلِ تنسیخ حق ہے۔ اگر ریاست نے اس میں سستی کا مظاہرہ کیا تو پھر اس کے ثمرات خواتین کو ہرگز نہیں مل سکیں گے۔ عدالتِ عظمٰی کا یہ تاریخی فیصلہ بھی صرف قانون کی کتابوں کی زینت بن کر رہ جائے گا، اور لاکھوں خواتین، جو اپنے وراثتی حق سے ابھی تک محروم ہیں، اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکیں گی۔

اس لیے کہ قوانین عوامی سہولت کاری کے لیے بنتے ہیں، لیکن جب ان پر عملداری کے انتظامات مثبت انداز میں نہیں کیے جاتے تو ان کا استعمال بھی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس تاریخی فیصلے کا فائدہ بھی تبھی ہوگا جب حکومت اور عوام مل کر خواتین کو ان کا حق دینے کی ٹھان لیں گے، ورنہ چند روز اس کی واہ واہ ہوگی اور پھر خواتین کی آہیں سنائی دیں گی۔ فیصلے تاریخی اور انقلابی اسی صورت میں ثابت ہوتے ہیں جب ان کا نفاذ سختی اور بے رحمی سے کیا جائے، ورنہ تاریخی فیصلے بھی صرف کتابی شکل میں تاریخ کا حصہ بن کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

مون سون بارشیں
چیلنجز، حقائق، ذمہ داری

ناصر نقوی

(مصنف سینئر جرنلسٹ اور کالم نویس ہیں)

"مون سون" کا موسم کوئی نیا نہیں، ہر سال آتا ہے اور آئندہ بھی آتا رہے گا۔ قدرت کے اس نظام کو کسی بھی منصوبہ بندی سے روکا نہیں جاسکتا۔ البتہ موجودہ حالات میں اس کی شدت موسمیاتی تبدیلی کے باعث بڑھ گئی ہے۔ معمول سے زیادہ بارشیں مسائل اور بحرانوں میں بھی اضافہ کریں گی، کیونکہ بارشیں زندگی، معیشت اور ہر قسم کے انفراسٹرکچر کے لیے ایک بڑا چیلنج ہوتی ہیں۔ صرف پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک ہی نہیں بلکہ ترقی یافتہ ممالک اور دنیا کی مضبوط معیشتیں بھی اس کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں۔ نظامِ قدرت اور دنیاوی ضروریات کے حوالے سے زراعت، ماحول اور آبی ذخائر کے لیے بارشیں ناگزیر ہیں، لیکن اگر قدرتی پانی کو مؤثر انداز میں جمع کرکے کارآمد نہ بنایا جاسکے تو یہی پانی بحرانی کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے میں غیر معمولی بارشوں کے خدشات سے سیلاب، لینڈ سلائیڈنگ، مخدوش عمارتوں کی تباہی، دریاؤں میں طغیانی، قیمتی مویشیوں کا نقصان اور فصلوں کی بربادی قومی المیہ بن جاتی ہے۔

موسمیاتی تبدیلی کے بعد یقیناً یہ خطرات پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکے ہیں، اس لیے موجودہ دور میں "مون سون" صرف ایک موسمی معاملہ نہیں بلکہ اسے قومی سلامتی، پائیدار ترقی اور خوشحالی کا مسئلہ سمجھنا ہرگز بے جا نہیں۔ آج پاکستان کا شمار موسمیاتی تبدیلی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ممالک میں کیا جاتا ہے، حالانکہ عالمی کاربن اخراج میں اس کا حصہ ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ تاہم 2022ء کے تباہ کن سیلاب اور بارشوں سے تقریباً چار کروڑ افراد متاثر ہوئے، ڈیڑھ ہزار سے زائد افراد جاں بحق ہوئے، لاکھوں مکانات تباہ ہوئے، سینکڑوں

دیہات زیرِ آب آئے، بلکہ درجنوں گاؤں اور دیہی بستیاں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ ان آفات سے محدود اندازوں کے مطابق 30 ارب ڈالر سے زیادہ کا نقصان ہوا۔ یہ اعداد و شمار اس لیے بھی تشویش ناک ہیں کہ موسمیاتی خطرات اب مستقبل کا نہیں بلکہ حال کا مسئلہ بن چکے ہیں۔

قومی ادارے این ڈی ایم اے کے مطابق یہ خدشات اس وقت بھی موجود ہیں۔ اسی لیے محکمۂ موسمیات اور این ڈی ایم اے نے الرٹ جاری کیا ہے کہ بارشیں معمول سے 40 سے 60 فیصد زیادہ ہونے کا امکان ہے، جبکہ ماہرین کے مطابق کم از کم 22 سے 26 فیصد زیادہ بارشیں متوقع ہیں۔ اس پیش گوئی کے تحت پنجاب، خیبر پختونخوا، کشمیر، شمالی بلوچستان اور سندھ کے کئی اضلاع کو سیلاب، شہری علاقوں میں بارشی پانی جمع ہونے اور پہاڑی ندی نالوں میں طغیانی کے خدشات کے پیشِ نظر حساس قرار دیا گیا ہے۔

حکومتی سطح پر وفاق اور صوبوں میں ماضی کے مقابلے میں اس مرتبہ قبل از وقت بہتر اقدامات کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ قومی ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (این ڈی ایم اے) نے صوبائی اداروں، پاک فوج، رینجرز، ریسکیو اداروں اور محکمۂ موسمیات کے اشتراک سے ایک مشترکہ نظام قائم کیا ہے، جس کے تحت حساس اضلاع کی نشاندہی، وارننگ سسٹم، ہنگامی آپریشن مراکز کی فعالیت، امدادی سامان کی ترسیل اور ریسکیو ٹیموں کی تعیناتی سمیت چیلنجز سے نمٹنے کے انتظامات مکمل کیے جا چکے ہیں۔ اسی طرح صوبائی حکومتوں نے بھی اپنی "مون سون" منصوبہ بندی نافذ کر دی ہے تاکہ کسی بھی ہنگامی صورتحال میں فوری ردِعمل ممکن بنایا جا سکے۔

پنجاب کی وزیرِ اعلیٰ مریم نواز نے اعلان کیا ہے کہ "زخم لگنے ہی نہ دینا حقیقی حکمرانی ہے، کیونکہ مرہم رکھنا کوئی کمال نہیں۔" ان کے مطابق ماضی میں ڈوبنے والے علاقوں کو محفوظ بنا دیا گیا ہے، آبپاشی کے نظام کو اپ گریڈ کر دیا گیا ہے، مویشیوں کی میپنگ مکمل ہو چکی ہے، اور کسی بھی ہنگامی صورتحال میں پوری حکومت یکجا ہو کر رسپانس دے گی۔ انہوں نے بتایا کہ سیلاب کی پیشگی اطلاع کے انتظامات بھی مکمل کر لیے گئے ہیں، کیونکہ بعد میں فائر فائٹنگ کرنا دانش مندی نہیں۔ ضلعی انتظامیہ سے خطاب کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ نے کہا کہ "مون سون" سے پہلے تمام اضلاع کو ضروری سامان اور جدید آلات فراہم کر دیے گئے ہیں۔ انہوں نے زوم لنک کے ذریعے صوبے بھر کی انتظامیہ سے اچانک رابطہ کر کے ضروری ہدایات بھی جاری کیں۔ ان کا کہنا تھا کہ موسمیاتی تبدیلی نے نئے امتحانات اور چیلنجز پیدا کر دیے ہیں، ہم مسلسل حالات سے سیکھ رہے ہیں کیونکہ اصل کامیابی پیشگی تیاری میں ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ بارشیں کس حد تک تباہی مچائیں گی، لیکن جب چیلنجز اور خطرات موجود ہوں تو حکومت اور اداروں کو ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے تاکہ نقصانات کو ہر ممکن حد تک کم کیا جا سکے۔ اسی لیے صوبائی کابینہ اور متعلقہ اداروں کو بھی الرٹ رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ وسائل کے اندر رہتے ہوئے محکمۂ موسمیات کی اطلاعات اور این ڈی ایم اے کی مشاورت و تجاویز کی روشنی میں تمام انتظامات مکمل کیے جا چکے ہیں۔ کوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں، اچھا کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ناقص کارکردگی دکھانے والوں سے باز پرس بھی کی جائے گی تاکہ عوام کا پیسہ صرف عوامی خدمت پر خرچ ہو۔

ان تمام اقدامات کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ برقرار ہے کہ کیا وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی تیاریاں واقعی زمینی حقائق کے مطابق مؤثر ثابت ہوں گی؟

یہ سوال اس لیے جائز ہے کہ بدقسمتی سے ہمارا ماضی کا تجربہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔ سابق حکمرانوں کے دعوے بھی کم و بیش یہی ہوتے تھے، لیکن ناکامی کی صورت میں توقعات سے زیادہ بارشوں کا بہانہ بنا کر بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ ہر سال بارشیں بھی ہوتی ہیں، "مون سون" سے پہلے ندی نالوں کی صفائی اور ہائی الرٹ کے اعلانات بھی کیے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی "مون سون" کے پہلے ہی جھٹکے کے بعد دیہی اور کم ترقی یافتہ علاقوں کے ساتھ ساتھ کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور اور دیگر شہروں کی سڑکیں نہروں اور علاقے تالابوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ بعض علاقوں میں گھنٹوں اور بعض مقامات پر ہفتوں پانی کھڑا رہتا ہے۔ یہی نہیں، بجلی کا نظام بھی تہس نہس ہو کر رہ جاتا ہے۔

اگر ان حقائق کا جائزہ لیا جائے تو اصل مسئلہ بارش یا اس کی شدت نہیں بلکہ شہری منصوبہ بندی کی خامیاں، غیر قانونی تجاوزات اور برساتی نالوں میں رکاوٹیں ہیں۔ سیوریج کا نظام برسوں پرانا ہے، آبادی میں مسلسل اضافہ ہوا لیکن نکاسی آب کے نظام کو اپ گریڈ نہیں کیا گیا۔ نتیجتاً معمول سے زیادہ بارشیں فوراً بحران کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ دیہی علاقوں میں صورتحال مزید سنگین ہوتی ہے، جہاں سیلاب سے فصلوں کے ساتھ ساتھ مال مویشی کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ سڑکیں، تعلیمی ادارے، بنیادی مراکزِ صحت اور پینے کے پانی کے ذرائع بھی متاثر ہوتے

ہیں۔ مجموعی طور پر ان نقصانات کا براہِ راست اثر زرعی پیداوار، غذائی تحفظ اور علاقائی معیشت پر پڑتا ہے۔

تاہم اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ وفاق، متعلقہ اداروں اور صوبائی حکومتوں نے اپنے اپنے وسائل کے مطابق منصوبہ بندی اور تیاریاں کی ہیں، لیکن یہ تیاریاں مثالی ثابت ہوں گی یا ناکام، اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ اصل صورتحال تو "مون سون" کے بعد ہی واضح ہوگی۔ فی الحال یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ادارہ جاتی ہم آہنگی، پیشگی وارننگ اور ہنگامی منصوبہ بندی کے معاملات میں مجموعی بہتری دکھائی دیتی ہے، لیکن مقامی حکومتوں کا مؤثر کردار، انفراسٹرکچر، نکاسی آب کا نظام اور تعمیراتی منصوبہ بندی اب بھی کمزور دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر شہر اور ہر علاقے کے بنیادی مسائل کا مستقل حل تلاش کیا جائے، اور اس عمل میں عوامی تعاون کو بھی شامل کیا جائے، ورنہ ہنگامی اقدامات محض "ریلیف برائے مون سون" تک محدود رہ جائیں گے۔

جب عوامی تعاون کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومتی اقدامات کی پذیرائی کے ساتھ ساتھ عوامی ذمہ داری کے فقدان کا بھی خاتمہ کیا جائے، کیونکہ شہریوں کی عملی بے احتیاطی اور احساسِ ذمہ داری کا فقدان خود مسائل کو جنم دیتا ہے۔ محلوں اور گلیوں میں کوڑا دان موجود ہونے کے باوجود نالیوں اور نالوں میں کچرا پھینکنا، بارشی پانی کی گزرگاہوں پر مکانات اور جھونپڑیاں تعمیر کرنا، حفاظتی سرکاری اقدامات اور ایمرجنسی الرٹس کو نظر انداز کرنا ایسے عوامل ہیں جو نقصانات اور مسائل میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

"مون سون" اور موسمیاتی تبدیلی ایک حقیقت ہیں، جنہیں فوری طور پر نہ روکا جا سکتا ہے اور نہ ہی ختم کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کے نقصانات اور اثرات میں ضرور کمی لائی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومتیں ہر سال صرف ہنگامی اقدامات کرنے کے بجائے پورا سال متعلقہ اداروں اور مقامی تنظیموں کے ساتھ مل کر جامع منصوبہ بندی کریں۔ سیوریج کے نظام میں بہتری، ناجائز تجاوزات کا خاتمہ اور عوامی شعور بیدار کرنے کے لیے مؤثر آگاہی پروگرام شروع کیے جائیں تاکہ عوامی مشاورت، ماحول دوست سرگرمیوں اور حفاظتی ہدایات پر عمل درآمد کے ذریعے معاشرتی رویوں میں مثبت تبدیلی لائی جا سکے۔

"مون سون" قدرتی نظام کے تحت ہر سال آتا رہے گا، اور موسمیاتی تبدیلی کے باعث اس کی شدت میں مزید اضافہ بھی متوقع ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اسے خوف اور تباہی کی علامت سمجھتے ہوئے صرف وقتی اقدامات اور ہنگامی ریلیف پر ہی انحصار کرتے رہیں گے، یا بہتر منصوبہ بندی، مربوط حکمتِ عملی اور اجتماعی ذمہ داری کے ذریعے "رحمتِ باراں" کو حقیقی معنوں میں سودمند بنائیں گے؟ فیصلہ اور منصوبہ بندی حکومت کرے گی، لیکن عوامی تعاون کے بغیر کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے غیر معمولی "مون سون" سے نمٹنے کے لیے غیر معمولی اور سخت گیر فیصلے بھی کرنا ہوں گے، ورنہ اس کی شدت ہر سال نئے بحرانوں کو جنم دیتی رہے گی۔

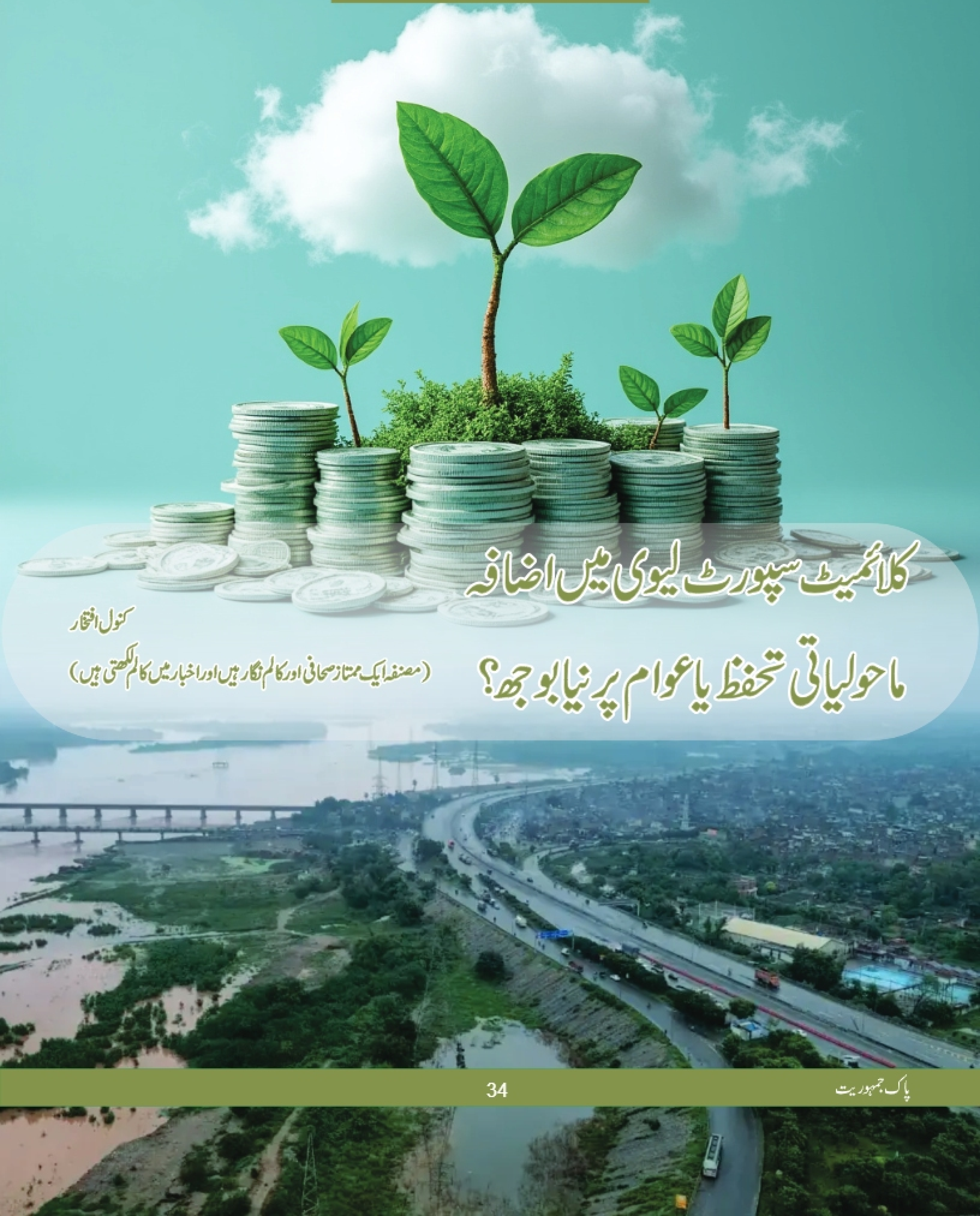

کلائمیٹ سپورٹ لیوی میں اضافہ
ماحولیاتی تحفظ یا عوام پر نیا بوجھ؟

کنول افتخار

(مصنفہ ایک ممتاز صحافی اور کالم نگار ہیں اور اخبار میں کالم لکھتی ہیں)

دنیا اس وقت موسمیاتی تبدیلی کے ایسے دوراہے پر کھڑی ہے، جہاں ترقی، معیشت اور ماحولیات کو ایک ساتھ لے کر چلنا ہر حکومت کے لیے ایک کڑا امتحان بن چکا ہے۔ یہ محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک ایسی زمینی حقیقت ہے، جس سے دنیا کا کوئی بھی ملک، چاہے وہ کتنا ہی طاقتور یا کمزور ہو، بچ نہیں سکتا۔ پاکستان بھی انہی ممالک میں شامل ہے جو عالمی سطح پر گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں انتہائی معمولی حصہ رکھنے کے باوجود موسمیاتی تبدیلی کے سب سے شدید اور بے رحم اثرات کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی ستم ظریفی ہے جسے سمجھنا مشکل نہیں، مگر اس کا حل تلاش کرنا انتہائی مشکل ہے۔ کبھی تباہ کن سیلاب گھروں کے گھر بہا لے جاتے ہیں، کبھی شدید گرمی کی لہریں انسانی زندگیوں کو نگل جاتی ہیں، کبھی خشک سالی کھیتوں کو ویران کر دیتی ہے اور کبھی پانی کی شدید قلت پورے علاقوں کو بحران میں دھکیل دیتی ہے۔ یہ سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لیتا، ہر گزرتے سال کے ساتھ اس کی شدت میں اضافہ ہی دیکھنے میں آ رہا ہے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں ملک کی معیشت، زراعت اور عوامی زندگی مسلسل جھٹکے کھا رہی ہے، اور جس میں حکومتوں کو غیر معمولی فیصلے کرنے پڑ رہے ہیں۔ انہی غیر معمولی حالات میں حکومت کی جانب سے کلائمیٹ سپورٹ لیوی میں اضافہ ایک اہم، مگر انتہائی متنازع فیصلہ بن کر سامنے آیا ہے۔ حکومت کا مؤقف یہ ہے کہ اس لیوی سے حاصل ہونے والی آمدنی ماحول دوست منصوبوں، قابلِ تجدید توانائی، موسمیاتی تبدیلی سے نمٹنے کے اقدامات اور عالمی ماحولیاتی اہداف کے حصول پر خرچ کی جائے گی۔ یہ ایک ایسا موقف ہے، جو بظاہر انتہائی معقول اور بروقت دکھائی دیتا ہے، خصوصاً ایسے ملک میں جو خود موسمیاتی تباہ کاریوں کا سب سے بڑا نشانہ بن چکا ہو۔

دوسری طرف ناقدین کا کہنا ہے کہ اس کا اصل اور حقیقی بوجھ عوام اور صنعتوں پر پڑے گا، جبکہ اس کے مثبت نتائج، اگر کوئی ہوئے بھی، فوری طور پر نظر نہیں آئیں گے۔ یہ ایک ایسی کشمکش ہے جو محض معاشی اعداد و شمار کا مسئلہ نہیں بلکہ عوامی اعتماد، حکومتی شفافیت اور طویل المدتی قومی حکمت عملی کا امتحان بھی ہے۔ سوال یہ ہے، اور یہ سوال آج ہر گھر، ہر بازار اور ہر پالیسی ساز کے ذہن میں گونج رہا ہے، کہ کیا یہ لیوی واقعی ماحول کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے، یا پھر یہ مہنگائی کے بوجھ تلے پہلے سے دبے ہوئے عوام پر ایک اور مالی دباؤ ہے، ایک اور بوجھ جو انہیں مزید نیچے دھکیل دے گا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کلائمیٹ سپورٹ لیوی دراصل ہے کیا۔ یہ بنیادی طور پر ایک ایسا مالیاتی ذریعہ ہے، جس کے تحت حکومتیں ایسے شعبوں سے اضافی رقم وصول کرتی ہیں جو فوسل فیول کے استعمال، کاربن کے اخراج یا ماحول پر منفی اثرات کا سبب بنتے ہیں۔ اس رقم کا بنیادی مقصد ماحول دوست منصوبوں کی مالی معاونت، شجرکاری مہمات، سیلاب سے تحفظ کے انتظامات، آبی وسائل کے بہتر انتظام، صاف اور قابلِ تجدید توانائی کے فروغ، اور ماحولیاتی انفراسٹرکچر کی تعمیر ہوتا ہے۔ نظری طور پر یہ ایک انتہائی مثبت اور دور اندیش پالیسی معلوم ہوتی ہے، ایک ایسا نظام جس میں آلودگی پھیلانے والوں سے وصول کی گئی رقم ماحول کی بحالی پر خرچ کی جاتی ہے۔

دنیا کے کئی ممالک اس نوعیت کے کاربن ٹیکس یا ماحولیاتی لیوی نافذ کر چکے ہیں۔ یورپی یونین، کینیڈا، جاپان اور کئی دیگر ترقی یافتہ معیشتیں ایسے نظام پر عمل پیرا ہیں تاکہ آلودگی پھیلانے والے شعبوں کو ان کے کیے کا زیادہ ذمہ دار بنایا جا سکے۔ تاہم اور یہاں ایک نہایت اہم فرق سامنے آتا ہے، ان ممالک میں عام طور پر اس لیوی کے ساتھ ساتھ متبادل توانائی کے وسیع منصوبے، جدید عوامی ٹرانسپورٹ کا نظام، سبسڈی کے پروگرام اور سماجی تحفظ کے مؤثر اقدامات بھی موجود ہوتے ہیں، تاکہ عوام پر پڑنے والا اضافی بوجھ کم سے کم رہے اور وہ اس تبدیلی کو برداشت کر سکیں۔ یہ ایک متوازن اور جامع پالیسی کی مثال ہے، جہاں ٹیکس صرف وصول نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عوام کو متبادل راستے بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔ پاکستان کی صورتحال اس لحاظ سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ نازک ہے۔ یہاں مہنگائی، توانائی کے مسلسل بڑھتے ہوئے نرخ، بے روزگاری اور عوام کی کمزور قوتِ خرید پہلے ہی انہیں شدید دباؤ میں رکھے ہوئے ہیں۔ ایک عام پاکستانی گھرانہ پہلے ہی بجلی کے بلوں، پٹرول کی قیمتوں اور روزمرہ اشیائے ضروریہ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے نبرد آزما ہے۔ ایسے میں اگر ایندھن یا توانائی پر کوئی اضافی لیوی عائد ہوتی ہے تو اس کے اثرات ہرگز صرف پٹرول پمپ تک محدود نہیں رہتے۔ یہ اثرات ایک لہر کی صورت میں پوری معیشت میں پھیل جاتے ہیں، ٹرانسپورٹ، زراعت، صنعت، خوراک، تعمیرات اور روزمرہ استعمال کی تقریباً ہر چیز کی قیمت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو رکنے کا نام نہیں لیتا اور جس کا نشانہ بالآخر ایک عام آدمی ہی بنتا ہے۔ اگر حکومت یہ لیوی پٹرولیم مصنوعات، ڈیزل یا صنعتی ایندھن پر بڑھاتی ہے تو سب سے پہلے اور سب سے تیزی سے ٹرانسپورٹ مہنگی ہوتی ہے۔ ٹرانسپورٹ کی قیمت میں اضافہ اشیائے خورونوش کی ترسیل کے اخراجات کو بڑھا دیتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ مہنگائی کی ایک نئی اور تکلیف دہ لہر کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اسی طرح صنعتوں کی پیداواری لاگت میں

اضافہ برآمدات کی عالمی مسابقت کو بھی شدید نقصان پہنچا سکتا ہے اور یہ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب پاکستان پہلے ہی سنگین معاشی مشکلات اور برآمدات بڑھانے کے کٹھن چیلنج سے دوچار ہے۔ ایک ایسی معیشت جو پہلے ہی سانس لینے کے لیے جدوجہد کر رہی ہو، اس پر ایک اور بوجھ ڈالنا یقیناً ایک حساس اور نازک فیصلہ ہے۔ اس ساری بحث میں حکمت کا مؤقف بھی اپنی جگہ انتہائی اہم اور نظرانداز کرنے کے قابل نہیں۔

پاکستان موسمیاتی تبدیلی سے متاثر ہونے والے دنیا کے سب سے کمزور ممالک میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ 2022 کے تباہ کن سیلاب کو کون بھول سکتا ہے، جس نے اربوں ڈالر کا نقصان پہنچایا، لاکھوں افراد کو بے گھر کر دیا، اور زراعت، سڑکوں، پلوں اور بنیادی ڈھانچے کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی برسوں پر محیط ہوگی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک قومی سانحہ تھا جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ عالمی اداروں کے مطابق آئندہ برسوں میں ایسے واقعات نہ صرف جاری رہیں گے بلکہ ان کی شدت اور تعداد میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر آج ماحولیات کے تحفظ پر سرمایہ کاری نہ کی گئی، اگر آج ہم نے اپنی آنکھیں بند رکھیں، تو کل اس کی قیمت کہیں زیادہ اور کہیں زیادہ تکلیف دہ انداز میں ادا کرنا پڑ سکتی ہے۔

اسی تناظر میں حکومت کا کہنا ہے کہ کلائمیٹ سپورٹ لیوی سے حاصل ہونے والی رقم سیلاب سے بچاؤ کے منصوبوں، ڈیموں کی بہتری، جنگلات کے فروغ، قابلِ تجدید توانائی کے منصوبوں، پانی کے بہتر انتظام اور دیگر ماحول دوست اقدامات پر خرچ کی جائے گی۔ اگر یہ سب واقعی

شفاف اور دیانتدارانہ انداز میں عمل میں لایا جائے، تو اس کے مثبت اور دیرپا نتائج یقیناً سامنے آسکتے ہیں، اور آنے والی نسلیں اس فیصلے کو دور اندیشی کی ایک مثال کے طور پر یاد رکھ سکتی ہیں۔ لیکن، اور یہاں اصل مسئلہ سر اٹھاتا ہے، اصل سوال محض پالیسی کا نہیں بلکہ اعتماد کا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں پوری بحث کا رخ بدل جاتا ہے۔ پاکستان میں عوام اس لیے بھی محتاط اور بدگمان ہیں کیونکہ ماضی میں مختلف ناموں سے عائد کیے گئے کئی ٹیکس اور لیویز کے بارے میں یہ تاثر گہرا ہو چکا ہے کہ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی اپنے اصل مقصد پر پوری طرح خرچ نہیں ہوئی۔ یہ کوئی بے بنیاد شک نہیں بلکہ برسوں کے تجربے سے جنم لینے والی حقیقت پسندانہ تشویش ہے۔ عوام نے ماضی میں دیکھا ہے کہ کس طرح خاص مقاصد کے لیے وصول کی گئی رقوم عام سرکاری خزانے میں گم ہو جاتی ہیں، اور جس مقصد کے نام پر وہ رقم وصول کی گئی تھی، وہ کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔ اگر کلائمیٹ سپورٹ لیوی سے حاصل ہونے والے فنڈز بھی اسی طرح عام سرکاری اخراجات میں ضم ہو گئے، اگر یہ رقم بھی دیگر بحرانوں کو ٹالنے کے لیے استعمال کر لی گئی، تو اس لیوی کا بنیادی اور اصل مقصد ہی مکمل طور پر ناکام ہو جائے گا، اور عوام کا رہا سہا اعتماد بھی مزید ٹوٹ جائے گا۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے، بلکہ ناگزیر ہے، کہ حکومت ایک مکمل طور پر شفاف اور قابل احتساب نظام قائم کرے۔ ایک ایسا نظام جس کے تحت ہر سال، بلکہ ہر سہ ماہی، عوام کو واضح اور مفصل انداز میں بتایا جائے کہ اس لیوی سے کتنی رقم جمع ہوئی، وہ رقم کہاں اور کن منصوبوں پر خرچ ہوئی، کتنے درخت لگائے گئے، کتنے حفاظتی اور دفاعی منصوبے مکمل ہوئے، کتنی قابلِ تجدید توانائی پیدا کی گئی اور موسمیاتی خطرات میں کمی لانے کے لیے عملی طور پر کون سے اقدامات کیے گئے۔ یہ شفافیت ہی وہ واحد پل ہے جو حکومت اور عوام کے درمیان اعتماد کی خلیج کو پاٹ سکتا ہے۔ بغیر اس شفافیت کے، کوئی بھی لیوی، چاہے اس کا مقصد کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، عوام کی نظر میں محض ایک اور بوجھ بن کر رہ جائے گی۔

ایک اور اہم اور بنیادی پہلو یہ ہے کہ ماحولیاتی پالیسی کبھی بھی صرف ٹیکس لگانے سے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کسی بھی پالیسی ساز کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ حکومت کو محض عوام سے رقم وصول کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے ساتھ ہی ساتھ متبادل اور قابل عمل سہولیات بھی فراہم کرنا ہوں گی۔ اگر عوام کو الیکٹرک گاڑیوں، شمسی توانائی، توانائی بچانے والے جدید آلات، جدید اور مؤثر آبپاشی کے نظام، اور ماحول دوست صنعتی طریقوں کی طرف منتقل کرنا مقصود ہے، تو ان کے لیے آسان اور کم شرح سود پر قرضے، حقیقی سبسڈی، اور عملی مراعات بھی اسی قدر ضروری ہیں۔ بصورت دیگر، صرف لیوی بڑھا دینے سے وہ مطلوبہ اور دیرپا نتائج کبھی حاصل نہیں ہو سکیں گے جن کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔ عوام کو صرف سزا دینا کافی نہیں، انہیں ایک بہتر اور قابل عمل راستہ بھی دکھانا ہوگا۔ صنعتی شعبے کی بھی اپنی الگ اور جائز تشویش ہے، جسے نظر انداز کرنا معیشت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ پاکستان کی صنعت پہلے ہی بجلی اور گیس کی بلند قیمتوں، شرح سود کی بلندی، خام مال کی بڑھتی ہوئی لاگت اور شدید عالمی مسابقت جیسے سنگین مسائل سے دوچار ہے۔ اگر اضافی لیوی صنعتی اخراجات میں مزید اضافہ کرتی ہے، تو اس سے برآمدات براہ راست متاثر ہو سکتی ہیں، جس کا اثر روزگار کے مواقع اور قیمتی زرمبادلہ پر بھی پڑے گا۔ یہ ایک ایسا خطرہ ہے، جو محض

صنعتکاروں تک محدود نہیں بلکہ لاکھوں مزدوروں اوران کے خاندانوں کی روزی روٹی سے جڑا ہوا ہے۔ لہٰذا پالیسی بناتے وقت صنعتوں کو ماحول دوست ٹیکنالوجی اختیار کرنے کے لیے مناسب اور پرکشش مراعات دینا بھی اسی قدر ضروری ہے، تاکہ سختی اور سہولت کے درمیان ایک متوازن راستہ نکالا جاسکے۔ عوامی سطح پر بھی اس اہم موضوع پر ایک سنجیدہ، جامع اور تعمیری مکالمے کی اشد ضرورت ہے۔

ماحولیات کا تحفظ بلاشبہ ایک قومی ذمہ داری ہے، ایک ایسی ذمہ داری جس سے کوئی بھی محب وطن پاکستانی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کی قیمت ایسے انداز میں ہرگز وصول نہیں کی جانی چاہیے کہ ملک کے کم آمدنی والے طبقے پر غیر متناسب اور ناقابل برداشت بوجھ پڑ جائے۔ اگر کسی نئی لیوی کا نفاذ واقعی ناگزیر ہو، اور اکثر یہ ناگزیر ہی ہوتا ہے، تو اس کے ساتھ ساتھ کمزور اور نادار طبقات کے لیے مؤثر ریلیف اور ٹھوس سماجی تحفظ کے اقدامات بھی لازمی طور پر ہونے چاہییں۔ ایک ایسی پالیسی جو امیر اور غریب کے درمیان فرق کیے بغیر یکساں بوجھ ڈالے، وہ نہ صرف غیر منصفانہ ہوگی بلکہ سماجی بے چینی کو بھی جنم دے سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے اور اسے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں، کہ پاکستان کو ماحولیات کے شعبے میں سنجیدہ اور بھرپور سرمایہ کاری کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ ضرورت شفافیت، مؤثر اور دیانتدارانہ منصوبہ بندی اور سب سے بڑھ کر عوامی اعتماد کی بحالی کی ہے۔ صرف نئے ٹیکس یا لیوی نافذ کر دینا، محض کاغذی احکامات جاری کر دینا، ہرگز کافی نہیں۔ یہ ثابت کرنا بھی اتنا ہی ضروری، بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے، کہ عوام سے وصول کی جانے والی رقم واقعی انہی مقاصد پر خرچ ہو رہی ہے جن کے نام پر یہ رقم ان سے وصول کی گئی تھی۔ اعتماد ایک ایسی چیز ہے جو تعمیر ہونے میں برسوں لگاتی ہے مگر ٹوٹنے میں لمحوں کا وقت لیتی ہے، اور ایک بار ٹوٹ جانے کے بعد اسے دوبارہ بحال کرنا کہیں زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔

کلائمیٹ سپورٹ لیوی میں اضافہ نہ تو مکمل طور پر ایک غلط فیصلہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے بغیر کسی تنقید اور جانچ پڑتال کے قبول کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے دونوں پہلو، یعنی اس کی افادیت اور اس کے ممکنہ نقصانات، یکساں طور پر حقیقی اور قابل غور ہیں۔ اگر اس سے حاصل ہونے والی آمدنی مکمل طور پر شفاف انداز میں موسمیاتی تحفظ، سیلاب سے بچاؤ کے منصوبوں، قابلِ تجدید توانائی کے فروغ، جنگلات کی بحالی اور آبی وسائل کی بہتری پر خرچ کی جاتی ہے، تو یہ یقیناً مستقبل کی ایک دانشمندانہ اور نتیجہ خیز سرمایہ کاری ثابت ہوسکتی ہے، ایک ایسی سرمایہ کاری جس کے ثمرات آنے والی نسلیں چکھیں گی۔ لیکن اگر یہ محض سرکاری محصولات بڑھانے کا ایک اور روایتی ذریعہ بن کر رہ جائے، اگر اس کے پیچھے نیک نیتی کے بجائے محض مالی ضروریات پوری کرنے کی سوچ کارفرما ہو، تو اس کا پورا بوجھ عوام کے کاندھوں پر آ گرے گا، جبکہ ماحولیات کو اس کا مطلوبہ اور جائز فائدہ کبھی نہیں پہنچے گا۔ آج پاکستان کو محض نئے محصولات کی نہیں، بلکہ ایسی جامع اور دور اندیش پالیسیوں کی ضرورت ہے، جو معیشت، ماحول اور عوامی مفاد کے درمیان ایک حقیقی اور پائیدار توازن قائم کریں۔ ایک ایسا توازن جو کسی ایک طبقے کو دوسرے پر قربان نہ کرے، جو ماحول کی حفاظت بھی کرے اور عوام کی معاشی مشکلات میں اضافہ بھی نہ کرے۔ یہی وہ نازک لیکن ضروری توازن ہے جو

بالآخر یہ فیصلہ کرے گا کہ کلائمیٹ سپورٹ لیوی ایک کامیاب، شفاف اور ماحول دوست حکمت عملی کے طور پر تاریخ میں یاد رکھی جائے گی، یا پھر عوام پر ڈالے گئے ایک اور غیر منصفانہ مالی بوجھ کے طور پر۔ اس فیصلے کی گھڑی اب حکومت کے ہاتھ میں ہے، اس کا نتیجہ آنے والے برسوں میں پوری قوم کی معاشی اور ماحولیاتی تقدیر کا تعین کرے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا، اور موسمیاتی تبدیلی کا بحران بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ جتنی دیر حکومت شفافیت، منصفانہ عملدرآمد اور عوامی اعتماد کی بحالی میں کرے گی، اتنا ہی یہ لیوی محض ایک اور متنازع ٹیکس بن کر رہ جانے کا خطرہ مول لے گی۔

دوسری طرف، اگر یہ فیصلہ دانشمندی، ایمانداری اور دوراندیشی کے ساتھ نافذ کیا جائے، تو یہی چھوٹا سا مالیاتی قدم پاکستان کو ایک ایسے راستے پر ڈال سکتا ہے جہاں ترقی اور ماحولیاتی تحفظ ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوں۔ بالآخر، اصل امتحان کسی ایک لیوی کے نفاذ کا نہیں بلکہ اس نیت، اس ارادے اور اس عزم کا ہے جس کے ساتھ یہ فیصلہ عملی جامہ پہنائے گا۔ یہی وہ عزم ہے جو طے کرے گا کہ کیا پاکستان واقعی ایک محفوظ اور سرسبز مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے، یا پھر ایک بار پھر اچھے ارادوں کے ساتھ شروع ہونے والا سفر ناکامی کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔

پاکستان کی نوجوان افرادی قوت
روزگار کے مواقع اور مستقبل

ڈاکٹر محمد گلزار
(ایسوی ایٹ پروفیسر، ڈائریکٹر سکول آف کامرس اینڈ اکاؤنٹنسی ۔ یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی (UMT))

پاکستان دنیا کے اُن چند ممالک میں شامل ہے جہاں نوجوانوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ملک کی ساٹھ فیصد سے زائد آبادی تیس سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جسے ماہرینِ معیشت اکثر "نوجوان بلج" یا"Youth Bulge" کا نام دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی آبادیاتی کیفیت ہے جو دنیا کے کسی بھی ملک کے لیے دوہری نوعیت رکھتی ہے: اگر اس نوجوان قوت کو مناسب تعلیم، ہنر اور روزگار کے مواقع میسر آجائیں تو یہ کسی بھی معیشت کے لیے ایک زبردست اثاثہ ثابت ہو سکتی ہے، لیکن اگر یہی نوجوان بغیر مواقع کے رہ جائیں تو وہی آبادی سماجی بے چینی، مایوسی اور معاشی جمود کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ پاکستان اس وقت دونوں امکانات کے سنگم پر کھڑا دکھائی دیتا ہے، اور اسی لیے نوجوان افرادی قوت کا مسئلہ محض ایک معاشی موضوع نہیں بلکہ ملک کے مستقبل کی سمت کا فیصلہ کن سوال بن چکا ہے۔

تعلیم اور روزگار کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج

پاکستان میں ہر سال لاکھوں نوجوان تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں، مگر معیشت میں اتنی تیزی سے نئی ملازمتیں پیدا نہیں ہو رہیں جتنی تیزی سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ نجی خبر رساں اداروں کی رپورٹوں کے مطابق انٹرمیڈیٹ اور اس سے اوپر کی تعلیم رکھنے والے نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح تقریباً ساڑھے بارہ فیصد تک جا پہنچی ہے، جو چند برس پہلے کے مقابلے میں نمایاں اضافہ

ظاہر کرتی ہے، جبکہ نوجوان خواتین میں یہ شرح اس سے بھی زیادہ ریکارڈ کی گئی ہے۔ دلچسپ اور تشویش ناک بات یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بے روزگاری کم تعلیم یافتہ افراد کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیکھی جا رہی ہے، جس نے "ڈگری کا مطلب نوکری نہیں" جیسے جملے کو عام گفتگو کا حصہ بنا دیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کا تعلیمی نظام ابھی تک زیادہ تر روایتی ڈگریوں پر انحصار کرتا ہے جبکہ مارکیٹ کو عملی مہارتوں، تکنیکی تربیت اور جدید ڈیجیٹل صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ نجی جامعات کی بڑھتی ہوئی فیسیں، سرکاری تعلیمی اداروں میں فنڈنگ کی کمی، اور دیہی علاقوں میں بنیادی انفراسٹرکچر کی عدم دستیابی نے اس خلا کو مزید گہرا کر دیا ہے۔ حالیہ اقتصادی سروے کے مطابق اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلے کی شرح میں بھی کمی واقع ہوئی ہے، جو ظاہر کرتی ہے کہ معاشی دباؤ کے باعث بہت سے نوجوان تعلیم مکمل کرنے کے بجائے جلد از جلد کمائی کی طرف رجوع کر رہے ہیں، چاہے وہ کم ہنر اور کم اجرت والی ملازمتیں ہی کیوں نہ ہوں۔

مجموعی بے روزگاری کی صورتحال اور عالمی تنبیہات

قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے خزانہ کے سامنے پیش کی گئی حالیہ بریفنگز میں ماہرینِ معیشت نے ملک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور مہنگائی پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ سرکاری تخمینوں کے مطابق مجموعی بے روزگاری کی شرح میں معمولی کمی متوقع ہے، مگر زمینی حقائق مختلف کہانی سناتے ہیں: بے روزگار نوجوانوں کی بڑھتی تعداد، کم اجرتیں، اور غیر رسمی شعبے کا پھیلاؤ ایک بڑا چیلنج بنا ہوا ہے۔ عالمی بینک نے بھی اپنے حالیہ اجلاس میں خبردار کیا ہے کہ آئندہ دس سے پندرہ برسوں کے دوران پاکستان سمیت ترقی پذیر ممالک میں لاکھوں نوجوان روزگار کے مواقع سے محروم رہ سکتے ہیں، اور اگر بروقت اقدامات نہ کیے گئے تو یہ صورتحال ایک گہرے سماجی و معاشی بحران کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ پاکستان کے تناظر میں یہ کوئی نئی پیش گوئی نہیں بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کئی برسوں سے سست روی سے بگڑتا آ رہا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اصل مسئلہ محض ملازمتوں کی کمی نہیں بلکہ معیشت کی ساخت ہے، جو زیادہ تر زراعت اور روایتی خدمات پر انحصار کرتی ہے جبکہ صنعتی شعبے میں سرمایہ کاری اور معاشی تنوع کی کمی نے نئے، باقاعدہ اور معقول اجرت والے روزگار کی تخلیق کو محدود کر رکھا ہے۔

آئی ٹی اور فری لانسنگ: امید کی ایک روشن کرن

اس تصویر کا دوسرا اور نسبتاً روشن رخ ملک کا تیزی سے پھیلتا ہوا ڈیجیٹل معیشت کا شعبہ ہے، جہاں نوجوانوں نے اپنی محنت اور مہارت سے حیران کن کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق رواں مالی سال کے ابتدائی گیارہ ماہ کے دوران ملک کی آئی ٹی اور آئی ٹی سے منسلک خدمات کی برآمدات چار ارب اٹھارہ کروڑ ڈالر سے تجاوز کر چکی ہیں، جو گزشتہ سال کے اسی عرصے کے مقابلے میں نمایاں اضافہ ہے۔ اس ترقی میں فری لانسرز کا کردار خاص طور پر قابلِ ذکر ہے: انہی گیارہ ماہ میں پاکستانی فری لانسرز نے ایک ارب ڈالر سے زائد کا زرِ مبادلہ کمایا، جو مجموعی آئی ٹی برآمدات میں ان کا حصہ پچیس فیصد تک لے گیا ہے، جبکہ ایک سال پہلے یہ حصہ بیس

فیصد کے قریب تھا۔ صنعتی اندازوں کے مطابق اس وقت ملک میں تقریباً تیس لاکھ فری لانسرز سرگرم ہیں، اور عالمی جائزوں کے مطابق پاکستان دنیا بھر میں فری لانسرز کی چوتھی بڑی افرادی قوت رکھنے والا ملک بن چکا ہے۔ سافٹ ویئر ڈویلپمنٹ، ویب ڈویلپمنٹ، ڈیجیٹل مارکیٹنگ اور اب مصنوعی ذہانت سے متعلق خدمات وہ شعبے ہیں جن میں پاکستانی نوجوان بین الاقوامی سطح پر اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ حکومت نے فری لانسرز کو باقاعدہ مالیاتی نظام میں شامل کرنے کے لیے پاکستان سافٹ ویئر ایکسپورٹ بورڈ میں رجسٹرڈ افراد کے لیے صرف پچیس فیصد کی شرح سے حتمی ٹیکس رجیم برقرار رکھی ہے، جسے صنعت کے ماہرین ایک مثبت قدم قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ملک میں ایک سو ستر سے زائد وینچر کیپیٹل کی

معاونت یافتہ اسٹارٹ اپس فعال ہیں جن کی مجموعی مالیت چار ارب ڈالر سے تجاوز کر چکی ہے، جو نوجوانوں کے لیے روایتی ملازمتوں سے ہٹ کر روزگار اور کاروبار کے نئے دروازے کھول رہی ہے۔ تاہم ماہرین یہ بھی متنبہ کرتے ہیں کہ مصنوعی ذہانت کی تیزی سے بڑھتی ہوئی صلاحیت ڈیٹا انٹری یا سادہ گرافک ڈیزائن جیسے کاموں کو متاثر کر رہی ہے، اس لیے فری لانسرز کے لیے پرامپٹ انجینیئرنگ اور جدید ڈیجیٹل مہارتیں سیکھنا وقت کی اہم ضرورت بن چکا ہے۔ بلاتعطل انٹرنیٹ کی فراہمی اور عالمی ادائیگی کے نظاموں جیسے پے پال تک براہ راست رسائی نہ ہونا اب بھی اس شعبے کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ کے طور پر موجود ہے۔

بیرونِ ملک روزگار اور بڑھتا ہوا برین ڈرین

پاکستانی نوجوانوں کے لیے روزگار کا ایک اور بڑا راستہ بیرونِ ملک ملازمت اختیار کرنا رہا ہے، اور حالیہ برسوں میں اس رجحان میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ وزارتِ سمندر پار پاکستانیز اور بیورو آف امیگریشن کے اعداد و شمار کے مطابق سال دو ہزار پچیس کے دوران سات لاکھ باسٹھ ہزار چار سو ننانوے پاکستانی روزگار کے حصول کے لیے بیرونِ ملک گئے، جو گزشتہ سال کی نسبت تقریباً پانچ فیصد زیادہ ہے۔ ان میں سب سے بڑی تعداد سعودی عرب جانے والوں کی رہی، جہاں پانچ لاکھ تیس ہزار سے زائد افراد نے ملازمت اختیار کی، یعنی مجموعی بیرونِ ملک روزگار کا تقریباً ستر فیصد صرف سعودی عرب کے حصے میں آیا، جبکہ قطر، متحدہ عرب امارات اور بحرین دیگر اہم منزلیں رہیں۔ ان مہاجر کارکنوں میں بڑی تعداد عام مزدوروں، ڈرائیوروں اور تکنیکی عملے کی ہے، مگر ساتھ ہی ڈاکٹروں، انجینئروں اور اساتذہ جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ پیشہ ور افراد کی روانگی بھی مسلسل جاری ہے۔ اسی رجحان کا دوسرا اور زیادہ تشویش ناک پہلو وہ ہے جسے عام طور پر "برین ڈرین" یعنی ذہانت کے انخلا کا نام دیا جاتا ہے۔ پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈیویلپمنٹ اکنامکس کی ایک رپورٹ کے مطابق ملک کو ہنرمند افراد کی نقلِ مکانی سے سالانہ تقریباً بائیس ارب ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اگرچہ حکومتی حلقوں میں اسے "برین گین" یعنی ذہانت کے حصول کی نئی اصطلاح سے متعارف کروانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور اس نقلِ مکانی سے آنے والی ترسیلاتِ زر ملکی معیشت کے لیے یقیناً اہم سہارا ثابت ہوتی ہیں، مگر تجزیہ کار اس بات پر متفق ہیں کہ ملک کا بہترین تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ سرمایہ طویل مدت میں اپنے ملک کی ترقی میں حصہ ڈالنے کے بجائے دوسرے ممالک کی معیشتوں کو مضبوط کر رہا ہے۔

حکومتی اقدامات اور پالیسی کی سمت

اس صورتحال کے پیشِ نظر وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی جانب سے نوجوانوں کے لیے مختلف اقدامات بھی سامنے آئے ہیں۔ حکومت کے "اڑان پاکستان" وژن کے تحت آئی ٹی برآمدات کو آئندہ برسوں میں دس ارب ڈالر تک لے جانے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے، جسے ماہرین ناممکن نہیں سمجھتے بشرطیکہ ڈیجیٹل انفراسٹرکچر، بجلی کی بلاتعطل فراہمی اور تربیتی پروگراموں پر مسلسل توجہ دی جائے۔ ڈیجی اسکلز جیسے پروگراموں کے ذریعے لاکھوں نوجوانوں کو مفت آن لائن تربیت فراہم کی جا رہی ہے، جبکہ رواں مالی سال کے وفاقی بجٹ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے چھیالیس ارب روپے اور سائنس و ٹیکنالوجی کے شعبے کے لیے ساڑھے تین ارب روپے سے زائد مختص کیے گئے ہیں۔ صوبائی سطح پر بھی نئے اقدامات دیکھنے میں آئے ہیں، جیسا کہ پنجاب حکومت کی جانب سے ہنرمند نوجوانوں کے لیے "پرواز کارڈ" کا اجرا اور تین لاکھ روپے تک کے بلاسود قرضوں کی فراہمی، جس کا مقصد نوجوانوں کو روزگار کے متلاشی کے بجائے روزگار پیدا کرنے والا بنانا ہے۔ اسی طرح پنجاب حکومت نے ہنرمند افراد کو بیرونِ ملک روزگار کی عالمی منڈی سے جوڑنے کے لیے بھی باقاعدہ منظوری دی ہے، تاکہ قانونی اور محفوظ ذرائع سے بیرونِ ملک

جانے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاسکے اور غیر قانونی طریقوں سے یورپ جانے کے بڑھتے رجحان کو روکا جاسکے، جو کم ہوتے روزگار کے مواقع کے باعث حالیہ برسوں میں تشویشناک حد تک بڑھا ہے۔ تاہم ناقدین کا کہنا ہے کہ ایسے پروگرام اپنی نوعیت میں مثبت ضرور ہیں مگر ان کا دائرہ کار اور فنڈنگ ملک کی وسیع نوجوان آبادی کی ضروریات کے مقابلے میں ابھی بھی بہت محدود ہے، اور محض قرضوں یا مختصر تربیتی کورسز سے ساختی مسائل حل نہیں کیے جاسکتے۔

چیلنجز جو بدستور برقرار ہیں

اس تمام صورتحال میں کئی گہرے ساختی مسائل اب بھی جوں کے توں موجود ہیں۔ دیہی علاقوں میں انٹرنیٹ، بجلی اور بنیادی تعلیمی سہولیات کی کمی، خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے، ایک بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ڈیجیٹل معیشت کے ثمرات ابھی تک بڑے شہروں تک ہی محدود دکھائی دیتے ہیں۔ ووکیشنل اور تکنیکی تربیت کا دائرہ بھی نہایت محدود ہے، جبکہ نجی شعبے کو پیچیدہ ٹیکس نظام، غیر یقینی پالیسیوں اور بیوروکریٹک رکاوٹوں کا سامنا ہے جو روزگار پیدا کرنے کی صلاحیت کو محدود کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی و پالیسی تسلسل کی کمی بھی ایک بڑا مسئلہ ہے، کیونکہ نوجوانوں کے لیے بنائے گئے بہت سے پروگرام حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ہی سست پڑ جاتے ہیں یا مکمل طور پر ختم ہو جاتے ہیں۔ ماہرینِ معیشت کا کہنا ہے کہ جب تک تعلیمی نصاب کو مارکیٹ کی حقیقی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں کیا جاتا، نجی شعبے، اسٹارٹ اپس

اور چھوٹے کاروباروں کو فروغ دینے کے لیے ٹھوس مراعات نہیں دی جاتیں، اور برآمدی صنعتوں میں سرمایہ کاری میں اضافہ نہیں کیا جاتا، اس وقت تک محض چند ڈیجیٹل کامیابیوں کے سہارے پورے نوجوان طبقے کو روزگار فراہم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

متوازن نتیجہ: چیلنج بھی، مواقع بھی

پاکستان کی نوجوان افرادی قوت کا معاملہ سیاہ و سفید میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف روایتی ملازمتوں کی قلت، تعلیم اور مارکیٹ کی ضروریات کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ، اور بیرونِ ملک ہنرمندوں کی مسلسل روانگی ملک کے لیے حقیقی اور سنگین چیلنج ہیں، جن کا اعتراف حکومتی اداروں سے لے کر عالمی بینک تک سب کر چکے ہیں۔ دوسری طرف آئی ٹی برآمدات، فری لانسنگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت، اسٹارٹ اپ ماحولیاتی نظام کی ترقی اور حکومتی سطح پر شروع کیے گئے مختلف تربیتی و مالیاتی پروگرام یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر درست سمت میں مسلسل اور ٹھوس سرمایہ کاری کی جائے تو یہی نوجوان آبادی ملک کی معاشی تقدیر بدلنے کی حقیقی صلاحیت رکھتی ہے۔ فیصلہ کن عنصر آنے والے برسوں میں پالیسی سازوں کی سنجیدگی، تعلیمی اصلاحات کی رفتار، نجی شعبے کے لیے سازگار ماحول کی فراہمی اور ڈیجیٹل انفراسٹرکچر میں مسلسل بہتری ہوگا۔ اگر یہ اقدامات حقیقی معنوں میں اور تسلسل کے ساتھ اٹھائے گئے تو پاکستان کا نوجوان بلج ایک بوجھ کے بجائے واقعی ایک قومی اثاثہ ثابت ہو سکتا ہے، ورنہ موجودہ رجحانات کے تسلسل کی صورت میں بے روزگاری، مایوسی اور بیرونِ ملک نقلِ مکانی کا سلسلہ مزید گہرا ہوتا چلا جائے گا۔

ہماری مطبوعات

قیمت امریکی ڈالر	قیمت پاکستانی روپے	زبان	مطبوعات	نمبر شمار
$-05	150/-	انگریزی	قائداعظم محمد علی جناح خطابات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (مجلد)	1
$-05	150/-	انگریزی	قائداعظم محمد علی جناح خطابات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (پیپر بیک)	2
$-17	350/-	اردو	قائداعظم محمد علی جناح خطابات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (پیپر بیک)	3
$-17	350/-	انگریزی	قائداعظم محمد علی جناح (تصویری البم) 1876ء تا 1948ء (مجلد)	4
$-17	350/-	انگریزی	قائداعظم محمد علی جناح (تصویری البم) 1876ء تا 1948ء (پیپر بیک)	5
$-04	100/-	انگریزی	قائداعظم کے سنہری اقوال	6
$-03	50/-	انگریزی	اقوالِ قائد (پیپر بیک)	7
$-15	400/-	انگریزی	قائداعظم کے بانی محمد علی جناح	8
$-10	250/-	انگریزی	جناح عوامی کاوشیں (آرٹ پیپر بیک)	9
$-10	250/-	اردو	مادرِ ملت سوانح حیات	10
$-10	250/-	اردو	مادرِ ملت تصویری البم	11
$-04	200/-	انگریزی	پاکستان ویژول کرانیکل	12
$-17	450/-	انگریزی	پاکستان کرونولوجی 1947ء تا 2006ء (چار جلدیں)	13
$-15	400/-	انگریزی	پاکستان کرونولوجی 1947ء تا 2006ء (پیپر بیک) (چار جلدیں)	14
	250/-	انگریزی	پاکستان دستکاریاں	15
$-02	50/-	انگریزی	پاکستان بنیادی حقائق	16
$-120	2000/-	انگریزی	آج کا پاکستان ایک طائرانہ نظر	17
$-20	1000/-	انگریزی	پاکستان سیاحت (...)	18
$-20	500/-	انگریزی، عربی، فرانسیسی، چینی	پاکستان آئینی دستاویزات (...)	19
$-125	2500/-	انگریزی	اولڈر امیجز	20
	60/-	انگریزی	بچوں کے کتابچے	21
$-12	200/-	انگریزی	طرزِ حیات	22
$-08	200/-	انگریزی	ٹرک آرٹ	23
$-04	100/-	انگریزی	گندھارا آرٹ ان پاکستان (از ڈاکٹر احمد حسن دانی)	24
$-04	100/-	انگریزی	مسلم آرٹ اینڈ ہیریٹیج آف پاکستان (از ڈاکٹر احمد حسن دانی)	25
$-01	15/-	اردو	اسلامی معاشرتی اقدار	26
$-04	100/-	اردو	دستِ افکار (علامہ اقبال کی شاعری سے انتخاب)	27
$-50	615/-	انگریزی	رحمت کا فرشتہ (عبدالستار ایدھی)	28
$-60	500/-	اردو	ماہِ نو غالب (خصوصی ایڈیشن)	29
$-17	350/-	اردو	ماہِ نو اقبال (خصوصی ایڈیشن)	30
$-60	500/-	اردو	ماہِ نو قائداعظم (خصوصی ایڈیشن)	31
$-60	500/-	اردو	ماہِ نو پاکستان (خصوصی ایڈیشن)	32
$-60	500/-	اردو	ماہِ نو احمد فراز (خصوصی ایڈیشن)	33
$-60	400/-	اردو	ماہِ نو احمد ندیم قاسمی (خصوصی ایڈیشن)	34
$-60	500/-	اردو	ماہِ نو جالب نمبر (خصوصی ایڈیشن)	35
$-60	400/-	اردو	ماہِ نو جوش (خصوصی ایڈیشن)	36
$-60	400/-	اردو	ماہِ نو انتخاب سلیم (خصوصی ایڈیشن)	37
$-60	400/-	اردو	ماہِ نو انتخاب 2018ء (خصوصی ایڈیشن)	38
$-15	400/-	اردو	ماہِ نو سید احمد خان (خصوصی ایڈیشن)	39
$-60	400/-	اردو	ماہِ نو منٹو (خصوصی ایڈیشن)	40
	100/- فی شمارہ	اردو	ماہِ نو (ماہنامہ) (گزشتہ شمارے)	41
		اردو	ماہِ نو (ماہنامہ) (آن لائن)	42
	10/-	اردو	پاک جمہوریت (...) (خصوصی ایڈیشن)	43
	100/- فی شمارہ	اردو	پاک جمہوریت (ماہنامہ) (گزشتہ شمارے)	44
		اردو	پاک جمہوریت (ماہنامہ) (آن لائن)	45
$-120	200/-	انگریزی	پاکستان پکٹوریل	46

رابطہ برائے خریداری

منیجر: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز، پی۔ ایف بلڈنگ، زیرو پوائنٹ، اسلام آباد، پاکستان۔ فون: 051-9252182 فیکس: 051-9252176

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز، اسلام آباد

ریجنل آفس: 291 اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور۔